نینا عادل

شبد

نینا عادل

نینا عادل

عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی ۹۵

© خالد جاوید (ہندوستان میں)

نام کتاب : شبد

شاعرہ : نیناعادل

مطبع : جواہر آفسیٹ پرنٹرس، دہلی

سرورق : اظہار احمد ندیم

ناشر : عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

SHABD

By **Naina Adil**

1st Edition: 2018 Rs: 200/-

ISBN : 978-93-87635-11-1

ملنے کے پتے

- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔6
- کتب خانہ انجمن ترقی اردو ہند، جامع مسجد، دہلی 011-23276526
- رائی بک ڈپو، 734، اولڈ کٹرہ، الہ آباد۔ 09889742811
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
- بک امپوریم، اُردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔4
- کتاب دار، ممبئی۔ 022-23411854
- ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، حیدرآباد
- مرزا ورلڈ بک، اورنگ آباد۔
- عثمانیہ بک ڈپو، کولکاتہ
- قاسمی کتب خانہ، جموں توی، کشمیر

arshia publications

A-170, Ground Floor-3, Surya Apartment, Dilshad Colony, Delhi - 110095 (INDIA)
Mob: +91 9971775969, +919899706640 Email: arshiapublicationspvt@gmail.com

عادل

کے نام

خال خال بھاتا ہے کوئی پوجنے والا
شاذ شاذ کھلتا ہے رشکِ دل یہ بت خانہ

فہرست

نظمیں

غزلیں

شبد سے نیشبد تک

نینا عادل کی شاعری پڑھتے ہوئے مجھے ستیہ جیت رے کی شہرۂ آفاق فِلم پاتھیر پنچالی کا وہ سین یاد آتا ہے جس میں سرکنڈوں کی جھاڑی میں چھپے ہوئے دو بچے دور سے آتی ہوئی ریل گاڑی کی آواز سنتے ہیں۔ جیسے جیسے ریلوے لائن پر ریل قریب آتی جاتی ہے، سرکنڈوں کی جھاڑیاں آہستہ آہستہ ہلنے لگتی ہیں۔

نینا عادل کے شبد بھی اُن سرکنڈوں کی سرسراہٹ کی طرح ہیں جو اپنے معنی اور معنی سے زیادہ اپنے بھاؤ (Sense) کے ''دباؤ'' سے زندہ ہوکر سرسرانے لگتے ہیں۔ یہ عجیب و غریب شاعری ہے۔ معنی کی سطح پر اس میں کوئی ابہام نہیں ہے۔ ویسے بھی ''معنی'' بڑے میکانکی ہوا کرتے ہیں اور ہر کیفیت کو اُس کے اسرار سے خالی کر کے اُسے ایک عامیانہ سی ٹھوس شکل دینے کی سازش میں تیار رہتے ہیں۔ چاہے وہ معنی کی مختلف جہات ہوں یا معنی آفرینی کا گھسا پٹا محاورہ۔ یہ شاعری اپنے بھاؤ یعنی Sense کے ذریعہ ہماری دنیا میں داخل ہوتی ہے (مجھے بھاؤ کا کوئی اُردو متبادل (احساس) بھی نہیں مِلا) بھاؤ وہاں نہیں ہوتا جہاں جُملہ ختم ہوتا ہے یا جہاں مصرع ختم ہوتا ہے۔ وہاں تو معنی یعنی ارتھ ہوتا ہے جو یا تو فوراً سمجھ میں آجاتا ہے یا لسانی قلابازیوں کے ذریعے کچھ دیر بعد سمجھ میں آتا ہے۔ بھاؤ اُن خالی جگہوں میں ہوتا ہے جو ایک جُملے سے دوسرے جُملے ایک مکالمے سے دوسرے مکالمے، ایک بیان سے

دُوسرے بیان یا شاعری میں ایک سطر سے دوسری سطر کے درمیان واقع ہوتی ہیں۔ بھاؤ اُس سطر کی لمبائی کے برابر کی دُوری طے کر کے آتا ہے اور اُس بظاہر نادیدہ خالی جگہ پر تھرتھرانے لگتا ہے۔ ندی کنارے اُگے ہوئے سرکنڈوں کی مانند جن کی تھرتھراہٹ سے یہ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ ندی میں پانی کا بہاؤ کتنا ہے۔ اس لیے یہ شاعری ہمیں ہمارے مکمل حواس کے ساتھ متاثر کرتی ہے یا صدمہ پہنچاتی ہے۔ بڑی شاعری کا کام متاثر کرنے سے زیادہ صدمے پہنچانے کا ہوتا ہے۔ مگر صِرف یہی نہیں، میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ یہ شاعری ہمارے اندر ایک نئے آلۂ حواس کو بھی پیدا کرتی ہے۔ ہمارے وجود میں ایک نئی جہت کا اضافہ ہمارے وجود میں داخل ہونے کے لیے، یہی اُس کا چور دروازہ ہے جس کا علم ہمیں بہت بعد میں ہوتا ہے۔ نینا عادل کو یہ سب کرنے کے لیے نہ تو اُردو شاعری کی روایت سے انحراف کرنا پڑا اور نہ ہی لسانی توڑ پھوڑ کا سہارا لینا پڑا۔ یہ کرشمہ اُن کے ''شبدوں'' نے اپنے انتخاب اور ترتیب کے ذریعے کر دکھایا ہے۔ یہ ''شبد'' زندہ الفاظ ہیں۔ یہ صرف سنائی نہیں دیتے، یہ دکھائی بھی دیتے ہیں۔ یہ اُن کی روح کی زبان کی لکنت میں چھپے ہوئے، تڑپتے ہوئے، شدت سے بھرے ہوئے الفاظ ہیں جو ایک کاروباری دنیا کی زبان کی دنیاوی قواعد کے مُردہ سانچوں میں فوراً اپنے شدید طور پر زندہ ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔ قواعد کے ان مُردہ سانچوں میں، زندہ رہنا، کپکپانا، تھرتھرانا، جل جانا اور بُجھ جانا اِن کا مقدر ٹھہرا۔

یہ شاعری بڑی سچی اور زندہ شاعری ہے۔ یہ کسی شعوری کاوش یا صناعی کے ذریعے وجود میں نہیں آئی ہے۔ اِس کا ماخذ نینا عادل کی روح کی دبیز اُداسی اور ایماندارانہ افسردگی ہے۔ یہی افسردگی اُن کے ایک ایک شبد کو ایک ایماندار ''ہندسے'' کی طرح شفاف بناتی ہے اور سچا بھی (میں نے اپنے افسانے میں غالباً لکھا تھا کہ لفظ کی انتہا یہ

ہے کہ وہ ''ہندسے'' میں بدل جائے)

حالاں کہ مجھے علم ہے کہ ''لفظ'' کی ابہامی کیفیت کو شاعری میں قابلِ قدر نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن میرے خیال میں ''لفظ'' یعنی ''شبد'' کو اتنا ایماندار ضرور ہونا چاہیے کہ وہ اپنے چاروں طرف چھائی ہوئی، ابہام کی دُھند کے باوجود ریاکاری سے بچ سکے تاکہ منافقت، جھوٹ اور نفرت کو ایمانداری، سچائی اور محبت سے بالکل الگ پہچانا جاسکے۔ اس کے بعد ہی میں ابہام، علامت سازی اور استعاراتی نظام جیسے شعری اوصاف یا لوازمات کا خیر مقدم کرسکتا ہوں۔

مگر اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نینا عادل کی شاعری میں کوئی اسرار نہیں ہے۔ اسرار اور ابہام میں فرق ہوتا ہے۔ اسرار (رہسیہ) ایک پاکیزہ اور روحانی عنصر کا نام ہے۔ وہ ایک ناقابل فہم فاصلے کا نام ہے۔ اسرار انسانی وجود اور کائنات کے درمیان ایک کھائی کا نام ہے۔ اِس فاصلے کو طے نہیں کیا جاسکتا نہ ہی اُسے جانا جاسکتا۔ اسرار تک پہنچنے کے لیے ''اسرار'' جیسا ہی ہوجانا پڑتا ہے۔ برخلاف اس کے ابہام محض لسانی کرشمہ سازیوں سے اور معنی آفرینی کے امکانات سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ ''شبد سے شبد'' تک کا ہی سفر طے کرتا ہے جبکہ اسرار شبد سے نیشبد'' تک کا سفر طے کرتے ہوئے زبان کی دنیا سے ہی ماورا ہوجاتا ہے۔

موسیقی بھی ایک اسرار ہے اور خدا بھی ایک اسرار۔ اسی لیے ہندو مذہب کے فلسفے میں موسیقی کے ذریعہ ایشور کی ذات میں ضم ہوجانے کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ہر موسیقی آہستہ آہستہ ایک سناٹے کی طرف بڑھتی ہے۔ ہر گیت اور ہر راگ خاموشی کے اسرار تک پہنچنے کی ایک کاوِش ہے اور یہ کاوِش بجائے خود ایک اسرار اور ایک ''بھید'' کے سِوا کچھ بھی نہیں۔

یہاں، ہمیں اِس نکتے کی طرف بھی توجہ مبذول کرنی چاہیے کہ ابھی تک ہمارے

قدیم کلاسیکل سنگیت میں کھڑی بولی کا دخل نہیں ہے۔ برج بھاشا یا بولیوں سے تو سنگیت بنا ہے مگر کھڑی بولی سے نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر مستقبل میں کسی سنگیت کار کو یہ کام کرنا پڑے تو اُسے نینا عادل کی شاعری کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ سنگیت یا موسیقی شبدوں سے نہیں بلکہ اس کے ''تلفظ'' اور آوازوں کے حاشیے سے پیدا ہوتی ہے۔اور یہ ادائیگی ہی شبد سے نیشبد تک کا سفر طے کرتے ہوئے موسیقی میں اپنی قلب ماہیت کرتے ہوئے ''خاموشی'' کے اسرار میں بدل جاتی ہے۔ نینا عادل کی نظم کا ایک ایک ''شبد'' اِس حوالے سے بہت اہم ہے جس کی ادائیگی اُس پُر اسرار خاموشی کی طرف بڑھتا ہوا قدم ہے جسے بُدھا کے مَون (خاموش رہنا) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اِس مقام پر نینا عادل کے یہاں وجود کی اُس نا قابلِ تشریح اُداسی کے آثار پیدا ہوتے نظر آتے ہیں جو کہ بُدھا کے ''دُکھ'' سے ایک رشتہ بناتے ہوئے کبھی نظر آتے ہیں۔ کبھی اوجھل ہو جاتے ہیں۔اسی لیے میں نے کہا تھا کہ نینا عادل کی شاعری کھڑی بولی کا سنگیت ہے۔

مگر یہ آسان کام نہیں ہے۔ یہ دلدل میں چپو چلانے جیسا ہے۔اپنے وجود کی دلدل میں چپو چلانا۔کبھی اُس میں سر سے لے کر پاؤں تک دھنس جانا اور کبھی اِس کالی دلدل کی سطح پر اُبھر آنا۔ یہ نا قابلِ یقین ہے۔ایک اور امر بار بار اپنی طرف میری توجہ کھینچتا ہے اور وہ یہ کہ آخر نینا عادل نے اپنی کتاب کا عنوان ''شبد'' ہی کیوں رکھا؟ وہ آسانی سے اِس کا اُردو متبادل ''لفظ'' رکھ سکتی تھیں۔میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ نینا عادل اس نکتے سے بخوبی واقف ہیں کہ ''شبد'' میں ایک روحانی اور مابعد الطبیعیاتی نظام پوشیدہ ہے جبکہ اس کا اردو متبادل ''لفظ'' اِن اوصاف سے تقریباً خالی ہے۔ قدیم ہندوستانی فلسفے میں ''شبد'' کی اِس نوعیت پر ایک طویل بحث موجود ہے۔

"شبد" اور اُس کی اِس مابعدالطبیعیات سے مل کر نیناعادل کی شاعری میں ایک ایسا انوکھا تماشا رچایا ہے جس میں صرف ایک ہی کردار ہے۔ اور وہ کردار ہے "سچ" کا۔ مگر یہ "سچ" بار بار ایک الگ مکھوٹا لگا کر آتا ہے۔ وہ اپنا اصل چہرہ ہمیں کبھی نہیں دکھاتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہ "سچ" کی کوئی شکل سی بن رہی ہے مگر پھر وہ دھندلی ہو جاتی ہے یا ہمارے اور اُس کے درمیان ایک بخار زدہ دھند آ کر بیٹھ جاتی ہے۔ شاعر کا المیہ بھی یہی ہے اور اُس کے ہونے کا جواز بھی یہی کہ اگر اُس کے "سچ" یا حقیقت مطلق کے درمیان یہ دُھند نہ ہو تو وہ صوفی، سنت، رِشی مُنی کچھ بھی ہو سکتا ہے مگر شاعر یا فن کار نہیں ہو سکتا۔ اُس کی داخلی تخلیقیت کا جبر اسے یہ فرصت فراہم نہیں کر سکتا کہ وہ اِس دُھند کو اِس بُخار کو اور اِس جالے کو درمیان سے ہٹا سکے۔

یہ "سچ" کا اِسرار ہے اور یہی زندگی کا بھی۔ جس طرح ایک سیلاب زدہ ندی کی دہشت اور اُس کے اسرار کو ندی کے پل پر لٹک کر ہی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ندی میں ڈوب کر نہیں، اُسی طرح زندگی اور موت دونوں سے تھوڑی سی دُوری۔ ایک ذرا سا فاصلہ ضروری ہے اور یہی اِس شاعری میں موجود ہے۔ ایک دُوری ایک خالی جگہ جہاں ایک ایک سطر کا بھاؤ موجود ہے یا پھر ابھاؤ۔ میں ایک بار پھر کہوں کہ بھاؤ کا مطلب یہاں جذبہ احساس اور خیال نہیں ہے۔ کسی "شے" کا ہونا یا نہ ہونا دونوں ٹھوس حیثیت کے حامل ہیں اور اِسی کا مقام سے وجودیت کے سچے افسردہ ماخذ پھوٹتے ہیں جنھوں نے اس تمام شاعری کو سیراب کر کے رکھ دیا ہے۔

میں نے دانستہ طور پر یہاں نیناعادل کی شاعری کے نمونے یا مثالیں پیش نہیں کی ہیں کیوں کہ میں اِسے کارِ رائیگاں سمجھتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ چند مثالیں پیش کر کے جو کچھ ثابت کیا جا سکتا ہے، دوسری مثالیں دے کر اس کے قطعاً الٹ بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔ یہ پیشہ ور نقادوں کی شعبدہ بازیاں ہیں جن سے میں الگ اور

لاتعلق رہنا چاہتا ہوں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ''کُل'' سے تو ''جُز'' کو سمجھا جا سکتا ہے مگر جُز سے ''کُل'' کو ہر گز نہیں۔ نہ تو فلسفے میں نہ سائنس میں، نہ مذہب میں اور ادب یا شاعری میں تو بالکل بھی نہیں۔ دوسرے یہ کہ میری یہ الٹی سیدھی تحریر اُن کی کتاب میں شامل ہے اس لیے مثالوں سے اور بھی گریز ضروری ہے۔ رہی بات نینا عادل کے شعری ڈکشن کی، اُن کی استعارہ سازی کی، اُن کی علامت نگاری کی، زبان کی سادگی اور بے ساختگی کی اور دوسے قابل تعریف اہم شعری آلات ولوازمات کی، تو اس پر میں اِس لیے گفتگو نہیں کرنا چاہتا کہ ایک تو میں اِس کے اہل نہیں ہوں دوسرے یہ کہ یہ تمام خصوصیات تو ہر اچھی شاعری بلکہ اچھی سے بھی کم شاعری کا حصہ ہوا کرتی ہیں۔ اِن باتوں کے بارے میں با قاعدہ تربیت یافتہ ناقِد یا تبصرہ نگار مجھ سے بہت بہتر لکھ سکتا ہے۔ مگر اِتنا تو مجھے ضرور کہنا چاہیے کہ یہ ایک غیر معمولی شاعری ہے۔ روایتی انداز میں تشریح کر کے اِس شاعری کا حق ادا نہیں جا سکتا۔ آپ ایک غیر جانب دار سرجن کی طرح دستانے پہن کر اِس کا پوسٹ مارٹم نہیں کر سکتے۔ (تشریح یا Analysis اور کیا ہوتی ہے؟)

'شبد' کی ہر نظم اور ہر سطر ایک زخم ہے۔ کچھ زخموں پر کھرنڈ جم گئے ہیں کچھ کے نشان باقی ہیں اور کُچھ زخم ایسے ہیں جن سے نیلا خون رِستا ہے۔ میرے ہاتھوں میں سفید دستانے نہیں ہیں۔ میں لکھتے وقت اِن زخموں کو اپنے ہاتھوں پر اُگتے ہوئے محسوس کرتا ہوں۔ یہ نینا عادل کی شاعری کے ساتھ اگر انصاف نہیں تو انصاف کرنے کی ایک کمزور سی کوشش ضرور ہے۔ اگر چہ یہ میری غلط فہمی یا خام خیالی بھی ہو سکتی ہے اور ممکن ہے کہ ''شبد'' نے اپنے اسرار کی طرف لے جانے والے تمام راستوں کی ناکہ بندی کر رکھی ہو۔

جب میں یہ کتاب پڑھ رہا تھا تو میرے ذہن میں ایک پل کو بھی یہ بات نہ آئی کہ

اسے ایک عورت نے لکھا ہے۔ یہ حیران کن حد تک کسی فیشن ایبل رجحان سے خالی شاعری ہے۔ یہاں نہ تانیثیت کی نام نہاد دانشورانہ جہت نظر آتی ہے اور نہ ہی کچی پکی رومان زدگی میں لپٹی ہوئی نسوانی بغاوت۔ یہاں جو بھی ہو رہا ہے وہ صرف اور صرف ''انسانی ذات'' کی سطح پر ہو رہا ہے۔ اپنی جنس کی حیاتیاتی حدود کی مجبوریوں میں رہ کر بھی، محض اور محض ''انسانی ذات'' کی سطح پر۔ ایسی شاعری کے لیے وجدان کی آفاقیت جتنی ضروری ہوتی ہے اُتنی ہی ذہانت بھی اور سلیقہ بھی۔ نینا عادل کے یہاں جو غیر معمولی ذہانت ہے وہ اُن کے وجدان کو اور زیادہ چمکا دیتی ہے اور اُن کی ہر سطر ایک ایسی روشنی میں نہائی ہوئی نظر آتی ہے جو کائنات اور ذات کے بارے میں، اُن کے اپنے انوکھے اور غیر معمولی وژن سے پیدا ہوتی ہے۔

اُن کی شاعری میں ایک چیز ایسی ہے جو پانی کی طرح بہہ رہی ہے۔ وہ اُن کی اُداسی ہے پاکیزہ نیلے پانی جیسی اُداسی۔ پانی کو بہنا ہوتا ہے۔ پانی اگر رُک جائے تو سڑ جاتا ہے۔ بدبو اور بساندھ دینے لگتا ہے۔ پانی ہمیشہ اپنے حصے کی زمین تلاش کر لیتا ہے۔ اُسے بہنا ہوتا ہے۔ ایک کھیل کھیلنا ہوتا ہے۔ ایک تماشا دِکھانا ہوتا ہے۔ دنیا کا نقشہ پانی کی مختلف دھاروں اور لکیروں سے بھرا پڑا ہے وہ کس طرح وہاں رینگتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

''شبد'' کی نظموں اور غزلوں دونوں میں، پوری کتاب کے صفحات پر، یہ اداسی پانی کی طرح بہہ رہی ہے۔ کوئی اس دائمی اور مستقل اُداسی کو مٹا نہیں سکے گا۔ خود نینا عادل بھی نہیں۔ پانی ساری دنیا کو غرق کر سکتا ہے مگر خود اپنے آپ کو نہیں۔ نینا عادل اس بہتے پانی، اِس رینگتی ہوئی اُداسی کا پیچھا کرتی ہیں۔ وہ اس کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ دوڑتی ہیں تاکہ اپنے آپ کو وہاں۔ دور بہتا ہوا دیکھ سکیں۔ وہ اسے اتنا آگے نہیں نکلنے دیتیں کہ یہ اُداسی اُن کی نظروں سے اوجھل ہو جائے۔

میں اس طرح کے کلیشے یا فرسودہ کلمات اِستعمال نہیں کرنا چاہتا کہ کہوں کہ نینا عادل کی شاعری میں بڑی تہہ داریت ہے یا بڑی گہرائی اور گیرائی ہے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ یہ سب ہوتے ہوئے بھی بہتوں کی شاعری اور اُن کی زندگی بھی (زندگی شاعری سے الگ نہیں) ایک سیدھی چکنی سڑک کی طرح ہوتی ہے جس پر چلتے ہوئے آپ کا چہرہ اور آپ کی پیٹھ سب دیکھتے رہتے ہیں۔ اتنا Exposure اچھا نہیں۔

نینا عادل کی زندگی یعنی شاعری سیدھی چکنی سڑک کی طرح نہیں ہے اُس میں چھوٹے چھوٹے سے گڈھے ہیں جن میں مٹیالا پانی بھرا ہوا ہے۔ جہاں وہ آرام سے چھپی رہتی ہیں اور کسی کو پتہ نہیں چلتا۔ اصل انسان یہیں تو رہتا ہے۔ پوشیدہ تلوں میں، گڈھوں میں، پرانے زخموں کے نشانوں میں۔ ہر زخم دوسرے زخم کو اپنی کہانی سناتا ہے۔ پھر ایک داستان کو درمیان میں روکتے ہوئے کسی دوسری داستان کے کالے جزیروں کی طرف بڑھ جاتا ہے۔

مگر سب سے بڑا کرشمہ جو یہاں نمودار ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ نینا عادل کی شاعری ''شبد'' سے ''نیشبد'' کی طرف سفر کرتے کرتے ''ایمان دار ہندسوں'' کی طرح ''سچ'' کی طرف سے ''جھوٹ'' کے خلاف ایک مقدمے بھی دائر کرتی رہتی ہے۔ جھوٹ کے خلاف ایک بغاوت، ایک Rebel مگر یہ بغاوت ''کامیو'' کے Outsider کی طرف سے نہ ہو کر، اُس سے بہت پہلے ''دوستووفسکی'' کے Underground سے ملتی جُلتی ہے جو اپنی اندرونی ذات Inner self کے بوجھ سے دبا ہونے کے باوجود حقیقت مطلق یا سچ کے دباؤ کو بھی اپنے کندھوں پر محسوس کرتا ہے۔

یقیناً مجھے علم ہے کہ نینا عادل کی اس کتاب کو ایک دوسری طرح سے بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ اُن کی شاعری کی دوسری طرح سے بھی تاویلات پیش کی جا سکتی ہیں۔ بہت سے ایسے زاویے ہوں گے جن کو میری جالا لگی آنکھیں دیکھنے سے مجبور ہیں اور یہ

بھی ممکن ہے کہ جو میں نے کہا ہے اُسے بالکل ہی رد کر دیا جائے مگر مجھے اِن باتوں کی کبھی کوئی پرواہ نہیں رہی۔ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ میں نے ''شبد کے نیشبد'' کے بیکراں سناٹے میں اکیلا ہو کر یہ سطریں لکھی ہیں۔ اس اکیلے پن کے دُکھ اور مسرت کو میں ہی سمجھ سکتا ہوں۔ اس دُکھ اور مسرت کے شریک کو میں خوش آمدید کہتا ہوں۔

— خالد جاوید

پیش لفظ

زندگی وہ خوشنما زخم ہے جسے کریدنے کی لذّت نے نظم ایجاد کی، پتّھر سے بت تراشے، رقص کے گر سیکھے، رنگوں کے بھید جانے اور سات سروں کو جنم دیا۔ زخم کو داغ میں بدلتے اور داغ کو مٹتے دیر نہیں لگتی مگر صداقت کے عظیم استعارے ہیں وہ داغ جو وقت کے سیاہ پنّے پر ستارے کی طرح دمکے اور چراغ کی مانند لو دیتے رہے۔

کیا جانوں اس خوش نما زخم سے لذّت کشید کرنے کے لیے میں نے شبد کا انتخاب کیوں کر کیا۔ کیوں مجھے اپنے وجود کے نامعلوم جزیروں میں شبد کی گونج بہت دور تک سنائی دیتی رہی۔ کیوں کر تخیل کی پہنائیوں میں جلوہ افروز رہے شبد کے ان گنت رنگ ... ہزار آنکھوں اور ہزار ہاتھوں والے قدیم دیوتا کی مانند کتنے ہی استعارے اور علامتیں اپنی آڑی ترچھی لکیروں میں سموئے ہوئے۔

اپنی انگلیوں میں شبدوں کے ست رنگی دھاگوں کی ملائم گرہیں الجھائے میں کراچی کے اک گنجان آباد علاقے میں واقع اپنے گھر کے ایک خاموش گوشے میں بیٹھی اپنی پہلی کتاب کا پیش لفظ لکھ رہی ہوں۔ کتاب جو سرحد پار شہر علم پرور دہلی سے شائع ہو رہی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر اب بھی یہ کتاب شائع نہ ہوتی تو میں اپنی ذات کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کی طرح اپنی نظموں، غزلوں اور گیتوں کو جانے کب تک یکجا نہ دیکھ پاتی اور نہ جانے کتنی بار خود سے اپنی طرف دیکھنے کا عہد کرتی، ارادے باندھتی،

خواب بنتی اور بھول جاتی۔ عشق ایسے کارِ مسلسل کا زندگی سے تقاضہ یہی رہا ہے کہ ایک لمحہ بھی اپنے لیے پس انداز نہ کروں اور پھر میرے عشق نے تو مجھے بچپن میں ہی بوڑھا کر دیا تھا تا کہ اپنی بیمار ماں کو سنبھال سکوں۔

ماضی کا سرمئی لفافہ کھولتی ہوں تو جانے کتنے ستارے موتی گر گر کر چارسو بکھرنے لگتے ہیں ...لال، سبز، سنہرے، روپہلے ستارے موتیاں کبھی کپڑے کی گڑیا اور کبھی پلاسٹک کی گڑیا کا روپ دھارتے ہوئے، کبھی پیاری چڑیا اور گڈ بائی بچپن جیسی کچی پکی نظموں میں ڈھلتے ہوئے کبھی رنگین پنسلوں اور واٹر کلرز سے بنے آڑے ترچھے خوب صورت نقش و نگار میں بدلتے ہوئے۔ ایک نادان بچی سوئی دھاگے میں پروتی جاتی ہے یہ دمکتے ستارے موتیاں گڑیوں کا جہیز تیار کرنے ان کے ہار بندوں کو پرونے ان کی ساڑھیوں پر گُل بوٹے کاڑھنے۔ یہ تب کی بات ہے جب امی ابھی بیمار نہیں پڑیں تھیں۔ دنیا ابو کی ڈانٹ سے زیادہ ڈراؤنی، دادی کی خاموشی سے زیادہ باتونی اور نانی کے قہقہوں سے زیادہ سہانی نہیں تھی۔ میں آپی اور عدیل پڑوس کے درختوں سے امرود اور بادام چرا کر کھاتے۔ ڈرائنگ بکس میں نقش و نگار بنانے کے ساتھ ساتھ گھر کی دیواروں، دروازوں، کتابوں، کاپیوں۔ ڈائریوں اس حد تک کہ ایک دوسرے کے چہرے تک پینٹ کر ڈالتے۔ عدیل کی انگریزی اور آپی کی ڈرائنگ ہمیں حیران کر دیتی۔ وہ رنگوں کو برتنے میں میری جیسی پاگل اور ہوس گیر نہیں تھی۔ گھر والوں سے چھپ چھپا کر امی ابو کے ایک دوسرے کو ابو کی بیرون ملک نوکری کے دوران لکھے گئے خطوط پڑھتے۔ گو بین السطور تو کیا سامنے کی سطریں بھی بمشکل سمجھ پاتے مگر اپنا نام کہیں لکھا دیکھتے تو خوب ہنستے کھلکھلاتے۔ سوچتی ہوں جب ان خطوط کا ذائقہ چکھنے کی عمر آئی تو یہ میٹھے حروف کتنے ترش، بے مزہ اور بے معنی ہو چکے تھے۔

آٹھ نو سال کی عمر میں ان خطوط میں لکھی ہوئی دل گداز شاعری مجھ پر کیا جانیے

کیوں اس قدر اثر انداز ہوتی تھی کہ میں وہ ساری نظمیں غزلیں اپنی ڈائریوں میں اتارنے لگی۔اور پھر الماری میں رکھی نثر و نظم کی کتابوں تک رسائی کا شوق بھی تو دل میں ان ہی خطوط کو پڑھ کر جاگا۔ ہفتہ وار یا ماہانہ منعقد کی جانے والی سماع کی محفلوں میں پڑھا جانے والا کلام سن کر اکثر دل بھر آتا اور میں ساتھی بچوں سے الگ تھلگ ہو کر پہروں قوالیوں کے سحر میں کھوئی رہتی۔ ان دنوں صابری برادران کا پیش کردہ علامہ اقبال کا شکوہ جواب شکوہ مجھے تقریباً پورا ہی ازبر تھا۔ابو اکثر ہمارے لیے بچوں کا معروف رسالہ ہمدرد نونہال خرید لاتے۔ بعد ازاں اس رسالے کے لیے میں نے بچوں کی کئی کہانیاں بھی لکھیں۔

دادا کو دکن کی تاریخ اور تہذیب سے کیسا عشق تھا اس کا اندازہ گفتگو اور رہن سہن کے علاوہ ان کے کمرے کی دیوار پر آویزاں نظام دکن کی بڑی چوڑی اور دھندلی تصویر اور ان کے پاس کسی آسمانی صحیفے کی طرح محفوظ کیے گئے اخبارات کے ان ٹکڑوں سے کیا جا سکتا تھا جس میں حیدر آباد دکن سے متعلق کسی بھی طرح کی کوئی خبر ہوتی۔ دادی کو اڑوس پڑوس کے لوگ گونگا سمجھتے تھے۔ وہ اپنی ساڑھی کے سفید بلاؤز جیسی ستھری اور بے رنگ تھیں۔اب محسوس ہوتا ہے کہ جیسے دادا دادی کے دل ہجرت کی گرد میں اٹ کر آبائی قبروں جیسے مقدس اور ویران ہو گئے تھے۔ میرے نانا عبدالصمد خان آگرہ کی ادب آموز خاک سے تعلق رکھتے تھے۔ ہندوستان کے بٹوارے کے بعد کراچی کے علاقے پی آئی بی کالونی میں سکونت اختیار کی۔ ابو جن دنوں روزگار کے سلسلے میں بیرونِ ملک رہے، امی نانا کے ہاں پی آئی بی کالونی میں ہی مقیم رہیں۔ میری پیدائش بھی یہیں نانی کے گھر سے بہت نزدیک واقع فراست کے اسپتال میں ہوئی۔ امی کا مزاج نانا جیسا سخت گیر اور مذہبی، میرا مزاج نانی جیسا آزاد، خوش باش اور بے باک۔ وہ واقعی میری آئیڈیل تھیں۔

امی کی کچھ خفیہ تحریریں ہیں جو ان کی مجذوبیت کا شاخسانہ ہیں۔ ان تحریروں کو انہوں نے کبھی کسی کو پڑھنے کی اجازت نہیں دی۔ وہ اپنی اس سلطنت کی مطلق العنان حکمراں ہیں۔ مجال ہے کہ کوئی پرندہ بھی ان سرسبز فضاؤں میں پر مار سکے۔ وہ جب ہوش وحواس سے بے گانہ ہوئیں تو بچپن سے بلوغت تک کا سفر شب وروز کی سہمی ہوئی چادر تانے مجھے کسی قیدی کی طرح گھر کی چار دیواری میں ہی طے کرنا پڑا۔ ایک بار اس قید سے فرار ہوئی تو علم ہوا کہ امی کی نظروں سے اوجھل ہو کر گلی میں کھیلنے کا انجام کتنا بھیانک ہوسکتا ہے۔ میں جانتی تھی وہ میری چیخ نہیں سنیں گی آنسو نہیں پوچھیں گی پھر بھی ان کے دوپٹے کا پلّو میرے لیے دنیا کی واحد پناہ گاہ تھی۔ باہر کی دنیا سے تعلق صرف اس حد تک تھا کہ کبھی کبھار اسکول کی شکل دیکھ لیتی یا امی کو اسپتال لے جاتی۔ پیسے کی ریل پیل اور ابو کی بے دلی اور بے گانگی نے یکے بعد دیگرے شاید ہر رشتے کی قلعی کھول دی تھی۔ کم عمری کی بندشیں اور صعوبتیں بچوں سے ان کے بچپن کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت کچھ چھین لیتی ہیں۔ اب بھی کبھی کبھار لوگوں کا سامنا کرتے ہوئے عجیب خوف محسوس کرتی ہوں اور اس خوف کو چھپانے کے لیے خود کو زیادہ پر اعتماد ظاہر کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔

عادل نے میری بے سلیقہ زندگی کو با مقصد بنایا۔ میری کسی کمی کو میری کمزوری نہیں بننے دیا۔ ہم نے سخت ترین موسموں میں دھوپ کی حدّت اور سردی کی شدّت ساتھ ساتھ جھیلتے ہوئے زندگی کی تلچھٹ میں چھپی سچائیوں کا کھوج لگایا۔ تلخیوں کے گھونٹ بھرے، تشنگی کا ذائقہ چکھا۔ شادی کے پہلے سال میرا آریان میری گود میں تھا اور پھر ماہ نور عادل اور ایمان عادل یکے بعد دیگرے یوں میرے شب وروز پر قابض ہوتے گئے کہ میری کُل کائنات سمٹ کر ان تینوں کی کلکاریوں تک محدود ہوگئی۔ مگر شوق اپنا رستہ تلاش کرتا رہا۔ عادل اس رستے کو ہموار کرتے رہے۔ ہائی اسکول سے

آ گے کی تعلیم میں نے شادی کے بعد حاصل کی۔ یہ دور ہر طرح سے کٹھن دور تھا۔ایک طرف ہمیں نام نہاد برادری سسٹم کی فرسودگی سے چھٹکارا حاصل کر کے تن تنہا ایک نئے سفر کا آغاز کرنا تھا اور دوسری طرف اپنی بے سروسامانی سے لڑ کر ایک گھر بنانا تھا جہاں ہمارے بچوں کے ساتھ ساتھ دیگر ضرورت مند طالبِ علم بھی با آسانی یا بلا معاوضہ تعلیم حاصل کر سکیں۔ ہم نے شب و روز کی محنت سے گھر بنایا اور اسی گھر کو ایک تعلیمی ادارہ بھی۔ اس ساری کشاکش نے مجھے عادل سے منسوب کچھ تلخیوں کچھ وحشتوں کو قبول کرنے کی قوّت بخشی۔ میں نے مرحوم پروفیسر آفاق صدیقی اور محترم آصف اکبر کی شاگردی میں اردو اور انگریزی ادب میں ماسٹرز کی ڈگریاں فرسٹ ڈویژن میں حاصل کیں اور پڑھانے کے ساتھ ساتھ ایک نجی تعلیمی ادارے میں ایڈمنسٹریشن کی ذمہ داری بھی نبھاتی رہی۔ میں نے ان بزرگ عزیزوں سے بہت کچھ سیکھا۔ خصوصاً آصف صاحب سے صبر کرنا، ان تھک محنت کرنا اور گلہ نہ کرنا سیکھا۔ جس کے لیے میں تاحیات ان کی ممنون رہوں گی۔

کسی فن پارے کا سب سے بڑا احسان اپنے متلاشی کی پناہ گاہ ہونا ہے۔ جہاں اس سکینت جو کی وحشت اور دیوانگی، فکر اور اداسی قیام کر سکے۔ کافکا، بورخیس، ہکسلے، تالستائے، دوستوئیفسکی، ورجینیا وولف، جیمس جوائز، نجیب محفوظ، مارکیز، کنڈیرا، کوئٹزی جیسے ادیب کسی ایسے ہی حساس مقام پر ہمارا تعارف ہم سے کرواتے ہیں۔ ہم خود کو عجب طور سے دیوان حافظ، کلام بیدل، میر و غالب کی غزلوں، بودلیئر، گوئٹے، مایا آنجلو، رابرٹ فراسٹ اور پابلو نرودا کی نظموں میں شناخت کرتے ہیں! مجھے بھولتا نہیں کہ کیسے وِدرنگ ہائٹس جیسے پراسرار ناول نے ایک مشکل وقت میں میرے رویے کو جواز فراہم کیا اور کیسے وہ میرے بکھرے ہوئے جذبات کے لیے ڈھال بنا رہا۔ کیسے خالد جاوید صاحب کے حیران کر دینے والے ناول ''موت کی کتاب'' نے مجھ پر میری ماں

کے نیم پاگل پن کا عقدہ کھولا۔ میرے محسنوں میں چند بزرگوں کے ایسی چند تخلیقات بھی شامل ہیں۔

شبد! زندگی کے خواب نما معبد میں ازل سے اک دیے کی طرح روشن تھا، سو اس کی روشنی میں جلنا بجھنا، غمِ روزگار اور غمِ عشق سے نبرد آزما رہنا، اپنی بیمار ماں کی تیمارداری کرنا اور اپنے بچوں پر ان محرومیوں کا سایہ نہ پڑنے دینا جنھوں نے ایک مدت تک مجھے یرغمال بنائے رکھا، میری زندگی کے اولین مقاصد ہیں۔ کہتے ہیں ڈوبتا ہی تیرتا ہے۔ میرے راستوں پر بھی ٹھوکروں کے بے شمار احسانات ہیں۔ میں نے اپنی آپ بیتی ایک مختصر سے علامتی افسانے میں یوں بیان کی ہے۔

سورج کی جلوہ فشاں اور بے نیاز نگاہ دشت پر کہاں ٹھہرنے والی تھی ...مگر ایک ذرّے کا دل اس زور سے دھڑکا کہ صحرا کو جھرجھری آ گئی۔

رعونت کے سب سے اونچے تخت پر براجمان سورج نے یہ تماشا جو دیکھا تو گستاخ ذرّے کا جگر چاک کرنے کے لیے دشت کے عین وسط میں ایک آتشیں نیزہ کھینچ مارا ...ذرّے کے پور پور میں سرخ انگارے بھر گئے۔

فنا ہو جا! سورج نے تلملا کر کہا۔

وحشت وحدّت ذرّے کے روم روم میں اترنے لگی...اک آتش فشاں مادہ اس کی لامتناہی کائنات میں دوڑنے لگا...آن کی آن میں اس کی تب وتاب پر دشت و گلزار کو اک نئے ابھرتے ہوئے سورج کا گماں ہونے لگا!

''مجھے فنا کرنا تیرے بس میں نہیں''....ذرّہ مسکرایا۔

حقیر ذرّہ لمحہ بھر کے لئے غبارِ نور بن کر نگاہِ کائنات میں پھیلا اور پھر خود میں سمٹ کر نقطۂ ناچیز بن گیا۔

سورج ذرّے کی خود نمائی پر تلملا اٹھا اور اس نے ہوا کو قاتل بنا کر فوراً دشت کی

جانب روانہ کیا۔

بے رنگ لبادے میں ملبوس ہوا زمین پر قہر بن کر دوڑنے لگی ...صحرا کے خشک ہونٹوں پر تشنگی نے پپڑیاں ڈال دیں ...سبز پتے سوکھ کر درختوں سے گرنے لگے۔ ہوا نے ذرّے کو دشت کے دامن سے اٹھا کر فضا میں اچھال دیا..بھنور چلے ...طوفان آئے ...چرند پرند سہم گئے۔

ذرّے نے مسکرا کر ہوا کے کان میں سرگوشی کی ''آخر کب تک؟''

یہ سننا تھا کہ ہوا کی ساری چنگھاڑ اور غرّاہٹ سیٹی میں بدل گئی۔اس نے گھبرا کر ذرّے کو ریت کے ڈھیر پر چھوڑا اور خراماں خراماں دوسری سمت چل دی۔

یہ ماجرا دیکھ کر سورج کی لال بھبوکا آنکھ میں غصّے کا آتشیں مادہ حیرت کے سیّال میں بدلنے لگا۔

ذرّے نے مسکرا کر کہا ''تمھاری زور آزمائی کا مقررہ وقت بیت چکا ہے غروب ہو جاؤ! کہ اب رات کے نادیدہ ہاتھوں اوس کے ان گنت موتی بکھرنے کو ہیں''۔

اپنی بھیدوں بھری کتھا کھول کر بھی نہ کھلتا ہوا شبد! شدھتا، سچائی، تنہائی، اداسی، سیاہی اور سفیدی کا استعارہ! دین، دھرم، فکر، فلسفے صداقت، تخلیقیت، ایجادیت، اور لطافت کی علامت۔سب سے بڑھ کر آزادی کے خواب کی علامت!

میں نے آج تک جتنے بھی خواب دیکھے ہیں ان میں سب سے دلفریب خواب آزادی کا ہے اور آزادی کا یہ خواب مجھے اپنے پرکھوں سے ورثے میں ملا ہے ...میر کہتے ہیں

اُٹھنے کی اک ہوس ہے ہم کو قفس سے ورنہ
شائستۂ پریدن بازو میں پر کہاں ہے

آزادی کے فسوں میں مبتلا ہیں، آوارگی سے خوش ہماری خاک کے ذرّے اور

قفس کی تنگ دیواریں۔ رابرٹ فراسٹ اپنی ایک نظم Mending Wall میں اپنے پڑوسی سے کہتے ہیں

Something there is that doesn't love a wall

اگر مجھ سے پوچھا جاتا ''کون ہے جو درمیان میں دیوار کھڑی کرتا ہے؟ تو میرا جواب ہوتا ''میں''۔ اور اگر یہ پوچھا جاتا کہ کون ہے جو درمیان میں اٹھائی جانے والی دیوار سے نفرت کرتا ہے تو کہتی ''میرے خواب''۔ یہ خود سے لڑی جانے والی ایک جنگ کی کہانی ہے (ازل سے جاری ایک جنگ) جس میں جیت خوابوں کی ہوئی اور میں نے تھوپے گئے عقائد اور نظریات سے بغاوت کرنی سیکھی اور ہر غیر ضروری دیوار، جنگلے، باڑ، بیریئر، ہر طرح کے جبر اور رکاوٹ سے بیزاری محسوس کی۔

انسانیت کی نیم وا آنکھوں میں ازل سے جہل، تعصب، غربت، ہوس، لالچ، فریب اور وحشت سے آزادی کا خواب دور ٹمٹاتے ستارے کی مانند روشن ہے۔ اس خواب کے عکاس ہیں آسمانی صحیفوں میں شجرِ ممنوعہ کے قصّے، مہا بھارت میں پانڈووں کے ہاتھوں دریودھن کی شکست، بقراط کے ہاتھ میں زہر کا پیالہ، ہومر کی عظیم نظمیں، مائکل اینجلو کے مبہوت کر دینے والے مجسمے، نیوٹن اور آئن اسٹائن کی دریافتیں، بورخیس اور کافکا کی رونگٹے کھڑے کر دینے والی کہانیاں، میر و غالب کے دیوان، سارتر کا فلسفۂ وجویت، آزادیٔ نسواں کی تحریکیں، مارکیز کے ہوش ربا ناول، رکمنی دیوی کا جادوئی رقص اور لتا کے دل موہ لینے والے گیت...

ہر مضطرب روح کی طرح میری روح بھی چاہتی ہے بتوں کو توڑنے کی آزادی، جوان اور گرم خون بھینٹ چڑھانے کی خوف ناک رسم سے آزادی، کنکریٹ کے جنگلوں سے اٹھنے والے دھوئیں اور بارود کی ناگوار بو سے آزادی، اپنی بے لگام اشتہا اپنی نامراد ہوس سے آزادی، رسموں رواجوں اور عبادتوں کے داخلی کھوکھلے پن

سے آزادی... مگر چونکہ قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں اس لیے جب اندر اور باہر حبس بہت بڑھ جاتا ہے تو میں شبدوں کی کھڑکی کھول کر نئے موسموں کو نئے رنگ زیب تن کرتا، نئی خوشبوؤں میں نہاتا دیکھتی ہوں۔ تازہ فضاؤں میں سانس لینے سے شکست و ریخت کے عمل کی کرب ناکی کیسی سہولت میں بدل جاتی ہے.. یہی سہولت اصل میں شاعری ہے...

— نینا عادل

10 March 2018

نظمیں

ایک سیّارے کا بوجھ

جب عمر بھر کی تھکن ماتھے کی سلوٹوں میں بدل جائے گی
اور میں لاٹھی ٹیک کر چلنے لگوں گی
تب دبے پاؤں میں اپنی ماں کے پیروں کے پاس آ کر لیٹ جاؤں گی
جب ڈاکٹرز میرے کھانے پینے پر پابندی لگا دیں گے
تب میں ان کچے امرودوں کا ذائقہ چکھوں گی!
جو میں نے اپنے بھائی کے ساتھ مل کر پڑوسیوں کے درختوں سے چرائے تھے
جب میری آنکھوں کے آگے روشنی کے سارے عکس دھندلا جائیں گے
تب میں پسِ دیوار چونٹیوں کے بلوں میں رکھا اناج دیکھوں گی
جب میری سماعت پر ضعیفی تالے ڈال دے گی
تب میں ان پرندوں کے گیت سنوں گی جو درختوں کے کٹنے سے پہلے یہاں آباد تھے
جب میری زرخیز مٹی نمی سے محروم ہو کر تڑخنے لگے گی
تب میں بارش میں بھیگی کم سن بچی کے دل سے کڑکتی بجلیوں کا خوف نکال دوں گی
جب میرے نفیس ہاتھ رعشہ زدہ اور بدہیئت ہو جائیں گے
تب میں اپنے اندر اُگے ہوئے آوازوں کے جنگل کی مہربان لکڑیوں سے ایک بربط
بناؤں گی
اور بے نیازی کی نئی دھن ترتیب دوں گی

(جسے سن کر جنگوں میں مرنے والوں کی روحیں شادکام ہوں گی)
جب میری چٹختی ہوئی کمزور ہڈیوں کا گودا سوکھنے لگے گا
تب میں ایک سیّارے کا بوجھ اپنی خمیدہ کمر پر لاد کر
ان ہواؤں کی طرف لوٹ جاؤں گی
جو میری ماں کی کوکھ میں آکسیجن بھرتی تھیں
جب میرے جاننے والے تعداد میں بے شمار ہوں گے
تب میں تنہائی کا ازلی بھید پاتال کی گہرائی سے ڈھونڈ لاؤں گی

جوالا مکھی

نا گہاں
آتشیں لو بھڑ کنے لگی سبز پتوں تلے
تلملاتی، غضب ناک اور... مشتعل
آگ
یکلخت بے تاب ہو کر اٹھی
آن کی آن میں
بیل بوٹے، شجر...
پھول، پتے، ثمر....
راکھ کا ڈھیر ہونے لگے اس طرح
سرخ شعلے نگلنے لگے گھونسلے
(گھونسلوں میں پڑے گوشت کے لوتھڑے)
بس دھواں رہ گیا دور تک راہ میں
اور بدلتا گیا ایک جنگل ہرا! دیکھتے دیکھتے
سرمگیں خاک میں
سبز منظر کوئی یوں جلا آنکھ میں

❀ ❀ ❀

کھیل جاری رہے

بے جھجک ، بے خطر
بے دھڑک وار کر
میری گردن اُڑا
اور خوں سے مرے کامیابی کے اپنی نئے جام بھر
چھین لے حسن و خوبی ، انا ، دلکشی
میرے لفظوں میں لپٹا ہوا مال و زر
میری پوروں سے بہتی ہوئی روشنی
میرے ماتھے پہ لکھے ہوئے سب ہنر
تجھ سے شکوہ نہیں

اے عدو میرے میں تیری ہمدرد ہوں
تیری بے چہرگی مجھ کو بھاتی نہیں
تجھ سے کیسے کہوں !!!
تجھ سے کیسے کہوں ! قتل کرنا مجھے تیرے بس میں نہیں
(اور ہو بھی اگر ، تیری کم مائیگی کا مداوا نہیں)

ہاں مگر تیری دل جوئی کے واسطے
میری گردن پہ یوں تیرا خنجر رہے
(تیری دانست میں)
کھیل جاری رہے

آبروریزی کے بعد

....آبروریزی کے بعد

رات
قتل کردی جاتی ہے
اور اس کے جوان جسم پر
دن کا پردہ ڈال دیا جاتا ہے

گھیرا

من میں رستہ ڈھونڈ رہا ہے چڑھتی ندی کا شور
بھیگ رہی ہے دھوپ سنہری
ڈوب رہے ہیں پیڑ، پرندے، بستی، پربت، ابر
ڈول رہا ہے نیل گگن تک
تن بھیتر بانہیں پھیلائے
گھیرا ڈالے
چھینٹ اڑائے
لہر لہر میں جادو منتر
رکھ دے روپ سروپ بدل کر
اوری میا
پانی رستہ کیسے ڈھونڈے
دیکھ سنبھل کر

❀ ❀ ❀

چار دیواری میں چنی ہوئی عورت

بند کے اُس طرف خود اُ گی جھاڑیوں میں لگی رس بھری بیریاں خوب تیار ہیں
پر مرے واسطے ان کو دامن میں بھر لینا ممکن نہیں
اے خدا! جگنوؤں، قمقموں اور ستاروں کی پاکیزہ تابندگی
وہ جگہ، سو رہی ہے جہاں پر چناروں کے اونچے درختوں سے نتھری ہوئی جانفزا چاندنی
...خوشبوئیں خیمہ زن ہیں جہاں رات دن
میری اُن سرحدوں تک رسائی نہیں
اور پچھم کی چنچل سریلی ہوا میرے آنگن سے ہو کر گزرتی نہیں
میں کہ بارش کے قطروں سے نتھرے ہوئے سبز پتوں کے بوسوں سے محروم ہوں
ان کواڑوں کی پرلی طرف دیر سے بند پھاٹک پہ ٹھہرے ہوئے اجنبی
آس اور بے کلی
حرف اور ان کہی
کچھ نہیں
میں نے کچھ بھی تو دیکھا نہیں
میرے کمرے کی سیلن، گھٹن اور خستہ دِواروں کے پیارے خدا
اور کچھ نا سہی
تو مجھے اک گنہ کی اجازت ملے

اے مرے شبد

اے مرے شبد، مرے بھید، مہا دھن میرے
رات میں خوشبو تری! نیند میں بوسہ تیرا...
ٹھنڈ میں آگ تری تاپوں، کھِلوں
جی اٹھوں!
اپنے آنسو ترے ہاتھوں کے کٹورے میں رکھوں
دیر تک تجھ سے لپٹ کر یونہی روتی جاؤں
اے مرے شبد! ترے معنی کی ست رنگ گرہ
کبھی سلجھاؤں
کبھی انگلی میں الجھا بیٹھوں
گم رہوں تجھ میں کہیں، تجھ میں کہیں کھو جاؤں
اے مرے شبد! مرے عشق، مرے افسانے
شام گل رنگ کرے، خواب کو دو چند کرے
تیری بارش میں نکھرتا ہوا سبزہ میرا
مانگ آشاؤں کی بھرتی ہوئی اس دنیا میں
اور کوئی بھی نہیں، کوئی نہیں
تو مرا!!!!

دھروٹ

ایک پرانے بکسے میں
بوسیدہ کپڑوں کے نیچے
کاغذ کے پرزوں کے پیچھے
تعویذوں، تاگوں کے بھیتر
دھات کے میلے ڈبے میں
مٹتے ہوئے فوٹو کے اندر
سرخ سنہری گوٹے کی
رنگین ستاروں والی جو
ریشم کی ساڑھی ہوتی ہے
ایک ابھاگن بڑھیا کو
وہ جان سے پیاری ہوتی ہے

پناہ

گزشتہ بارشوں کی بے چراغ راتوں میں
جب کہانیاں بُنتے ہوئے میری آنکھ لگ جاتی
تو کُتوں اور بھیڑیوں کا بھونکتا غراتا غول
میرے خوابوں پر ٹوٹ پڑتا
میری کار کے گرد
اور میرے مکان کے چارسو
اپنے اپنے بانٹے ہوئے علاقوں سے نکل کر
مجھ پر حملہ کرنے کے خاطر
ازلی دشمنوں کا ٹولہ!
ایک ہو کر
میری بو سونگھتا پھرتا

.....

لیکن تازہ بارشوں نے
خواب اور حقیقت کا فرق مٹا دیا ہے
لہذا!
اب وہ میکانکی وقت کے پابند نہیں رہے

اور سائیکالوجوکل وقت کے مطابق مجھے کھوجتے ہیں

ایک پہر میں چھیانوے بار.....

بھونکتے، غراتے اور رال ٹپکاتے ہوئے

مگر میں انہیں کہیں نہیں ملتی

نہ گھر میں، نہ گلی میں نہ کار میں

کیوں کہ اب میں ایک نظم کی پناہ میں ہوں

جس کی بُو سونگھنا

ان کے بس سے باہر ہے

آگ کے شکریہ کے ساتھ.....ایک نظم

مقدس گناہوں میں بھیگی ہوئی
آگ تاپی نہ ہوتی اگر چند پل
زوس کے تنگ ریفریجریٹر میں ٹھٹھرے ہوئے ماس کا پارسا لوتھڑا بن کے رہ جاتی!
میں نا جیتی نا مرتی پرومیتھیئس
اور فرشتوں کی مانند، وجدان پر میرے بھی، عمر بھر بھید گندم کا کھلتا نہیں
آہنی قفل ازلی روایت کے گر میں نہیں توڑتی
کچھ پرندے نہ آزاد ہوتے کبھی
برف ہوتیں مگر خون کی گرم امواج میں تیرتی سرمئی، سرخ اور نقرئی مچھلیاں
کوئے احساس میں کوئی بجلی کبھی کوندتی ہی نہیں دور تک
اک حقیقت کا بے تاب دل چیرنے
کس طرح پھر چناروں سے لپٹی ہوئی سرد تن چاندنی دھوپ بنتی دسمبر میں میرے لیے؟
میں کراچی کے ساحل پہ چلتے ہوئے کیسے گنگا کی لہروں پہ رکھتی قدم؟
کیسے دریاؤں کے دیوتا کیطرح، سوکھی فصلوں کو کرتی تراوٹ عطا؟
کیسے منٹو کے صفحات میں منتشر ''نیک بو'' سونگھتی؟
(کیسے ناپاک عورت کا سر چومتی)
کیوں ترس کھاتی معصوم دکھ اور فریبِ مسلسل پہ میں، فلورنٹائن کے؟

ان گنت کہکشائیں نہیں کھول پاتیں وہ اسرار جو، کھلتا ہے بدن پر اک آزاد پل
میری آزاد سانسوں کی خالص فضا، میری سنجیدگی
حرف کی یہ طہارت!
پرومیتھئیس باخدا
کچھ مقدس گناہوں سے مشروط ہے

کمین گاہ

آنتیں
ہوس گیر آنتیں
انسانیت کی صبح طلوع ہونے سے پیشتر
پیٹ کے تاریک غاروں سے نکل کر
زمین کے محیط پر کینچوے کی طرح رینگنے لگیں

بھوک
آدم خور بھوک
آگ کی حرارت محسوس کرنے سے قبل
لہو کے ذائقے سے واقف ہوگئی
اور ایک ہی جست میں
درخت کی اونچی شاخ سے رسوئی میں رکھے سالن کی ہانڈی میں آن گری

دانت
نوکیلے دانت
وحشی تہذیب کے بے ستر کنارے کُترتے کُترتے اتنے گِھس گئے

کہ سہولت سے پاپا جونز پزا چاب سکیں

پیاس

دریا کے کناروں پر رینگنے والی پیاس
جنگوں کے طبل بجانے کے بعد مفتوح بستیاں جلانے لگی! اور
شمپین کی کاک کھول کر
فنا کے نادیدہ تاروں پر ناچتے ہوئے
بقا کا جشن منانے لگی

موت

نشہ نہ کرنے والی
شتاب اور چوکس موت
اپنا پیٹ بھرنے کے لیے
ہماری اشتہا کی کمین گاہوں میں
ہماری زندگیوں کا سودا کرنے لگی

آخرِ شب

کوئی دستک مسلسل ہے، کہیں ہے مستقل آہٹ
ہوا کا شور ہے شاید
کبھی محسوس ہوتا ہے سنہرے خشک پتوں میں سے گزرا سانپ کا جوڑا
پرندہ کوئی سہما ہے
فضا میں سرسراہٹ ہے
مرے اندر بھٹکتی ہے کوئی آواز یا! شاید
بلاتیں ہیں مجھے اِس دم بچھڑنے والوں کی یادیں
وہ جن پر زندگی اک خوف کی صورت مسلّط ہے
کبھی کے ہار کے یا زندگی سے روٹھ بیٹھے جو!
کبھی یوں لگتا ہے جیسے کسی تاریک بستی میں
چلی آندھی!
قضا آئی
اجل شاید مری کھڑکی تلک... بستر تلک آئی
ستارے ڈوبنے کو ہیں

اندھیرا بین کرتا ہے
خدایا... نیند کا غلبہ
دیے کی لو بھڑکتی ہے
بجھا کر آخری لمحہ

اک ساون کا بار

اس نے
ایک پہر کا اُجلا ریشم
اِس مٹھی میں کیا رکھا
میں نے اس ریشم سے ست رنگی گل بوٹوں کی اک چادر بُن لی
رات میں اوڑھ کے سونے! اور
سویرے تان کے جاگنے
دھوپ میں اس کو ڈھال بنانے
شام کو اس میں کچھ گیتوں کے راز چھپانے
ایک پہر کی ریشم یعنی کافی ہے
اک ساون کا بار اٹھانے
اک جیون کے داغ چھپانے

مکاشفہ

(In the background of the famous masterpiece novel of D.H Lawrence ''Sons and Lovers" 1913, which miraculously deals with the dissatisfaction and inexplicable problems of the modern age)

(سنز اینڈ لوورز کے آخری حصے میں پاؤل مورل کے اپنی محبوب ماں
کو مارفین دینے کے حوالے سے کہی گئی نظم)

وقت کے تیز دھار چاقو سے کٹنے والی ہزاروں نسیں گیان کا رزق ہیں

....

پاؤل کا اپنی ماں کو مورفین دینا محبت کی حد ہے
محبت!
جس کے بے سدھ جسم پر کالا جادو کرنے کے لیے
چلاّ کاٹا گیا
کلارا کے خوشبودار کپڑے اتارے گئے
اور اس کی پرکشش ممتا سے عاری چھاتیوں میں ان گنت کیل ٹھونکے گئے
فیکٹریوں سے نکلتے کالے دھوئیں کی نچلی تہوں میں آرزو کے تعویذ گاڑے گئے
ایک حقیقت کی گلتی ہوئی لاش کو گمنامی کے تابوت میں رکھنے کے لیے

سفید پھولوں کے جنگل سے غیر مرئی لکڑیاں کاٹی گئیں

موت پھر بھی مہربان نا ہوا گر؟
اور وحشت زدہ متزلزل روز و شب سارے صحیفوں کے، ساری کتابوں کے سارے نقش
چاٹ جائیں تو پھر؟
تو پھر! کالے جادو کے زیرِ اثر
پاؤل کا اپنی ماں کو مورفین دینا محبت کی حد ہے

نطشے کا مغرب جانتا ہے

شام ڈھلے جن آجاتے ہیں ایک کنواری لڑکی پر
پھر تنگ نائے میں دیر تلک لوبان کی خوشبو اٹھتی ہے
درگاہوں کی قبروں سے اٹھتا ہے اگربتّی کا دھواں
سلگے ہوئے سگریٹ بجھتے ہیں جلتے ہوئے ذہنوں کے اندر
چشمہ رکھا ہے سستا سا کچھ جنسی کتابوں کے اوپر
نالی کے گندے پانی پر منڈلاتے رہتے ہیں مچھر
اور چونٹیاں چنگیری کی باسی روٹی پر اک لائن میں
طاقت سے زیادہ بوجھ اٹھائے سیدھ میں چلتی جاتی ہیں
ساڑھی کے میلے پلّو سے ناداری کی بو اٹھتی ہے
آنکھوں کے گدلے گنگا میں اک آس کا دیپک جلتا ہے
اور خوف کی بے رنگ چابی سے معبد کا تالا کھلتا ہے
نطشے کا مغرب جانتا ہے
(دھن کن فقراء میں بٹتا ہے)
مشرق کا خدا کیوں زندہ ہے

خمیازہ

ہر ماں نے فکری حبس میں
بچہ جننے کی غلطی کی
ہر ماں بھگتے گی خمیازہ

میں ایک مہاجر کی بیٹی ہوں

میں ایک مہاجر کی بیٹی ہوں
میرے ابّو جب کام پہ جاتے
تو ان کے لوٹ کے آنے تک
صحن میں دھول اُڑاتی مٹّی
سانسوں میں خدشے بھرتی تھی
امّی خود بھی چپ چپ رہتیں
ہم بھی شور نہ کرنے پاتے
میں اس گھر کی دیواروں پر لکھی خوف کی بھاشا پڑھ سکتی تھی
میں ایک مہاجر کی بیٹی....
چھ نمبر کی پھولوں والی ایک گلی میں
کالج کے اک اسٹوڈنٹ کی لاش پڑی ہے! دہشت گرد ہے
میری سہیلی کی ہاتھوں میں اس کا خط ہے جس میں بس اتنا لکھا ہے
''زندہ رہا تو عشق کروں گا''
اس دن صدر میں... بندوقوں کی تڑ تڑ تڑ میں
میں کالج کے ڈیسک کے اوپر کھرچ کھرچ کے لکھ آئی تھی
میں ایک مہاجر کی بیٹی ہوں

میرے دادا دکن سے اخبار، کتابیں اور مصلیٰ لائے تھے
اور میری دادی! ساڑھی، خاموشی اور آنسو...
ان کے چہرے کی شکنوں میں جذب اداسی اور ہجرت میں
اپنی ہری رگوں میں، شریانوں میں اور بدن کے ہر خلیے میں سمو چکی ہوں
میں نے کراچی کی گلیوں سے عشق کیا ہے
مجھ میں میرا کل زندہ ہے، مجھ میں میرا آج بپا ہے
میں ایک مہاجر کی بیٹی ہوں
اور میرے بچوں کا ورثہ ہے
جنگ بقا کی.....

چپ کا راج

جنگل میں آواج کے ٹھہرو ہر سو چپ کا راج
ٹہنڑی پھول نویں نالا وے، پیڑ نہ دیویں باج
جیب داب کے سو گیو پنڑ کے گاوے کوئی راگ؟
کنڈلی مار کے پھنکارے ہے ڈال ڈال پہ ناگ
ہر سکتی کو پوج پوج کے من میں گھٹ گیو سانس
دھوپ کی تیجی جھیل جھیل کے پڑ گیو پیلی گھاس
سوکھی بوٹی، بیر بھی پھیکو، مرجھایو ہریالی
کھر بوجے رس کیا ٹپکاویں مار گیو بھنڈ سالی
چار اور کے سورج بنسی اتریو سوکھو گھاٹ
ساگ سواد نہ دیوے سنگی، پنجر ہو گیو جاٹ
گونگو بہرو بستی تلپٹ سنے نا من کی چاپ
ناگ کے آگے رگڑیو متھا، ڈھیر کمایو پاپ
آپنڑے ڈر کی بلی چڑھ گیو، آپ ہی لگ گیو گھات
سوکھ گیو منہ کوئی نہ نکلیو جھوٹی سچی بات
راس کسی کو کب آوے ہے سبدوں کا اپمان؟
لکڑ پتھر ہو گیو سارو سوچوں کے کھلیان

سوچوں کے کھلیان گیو تو پھر کے آیو ہاتھ؟
اوپر والے تک نہ پہنچیو چیر کے چھاتی بات
جنگل میں آواج کے ٹھہرو ہر سو چپ کا راج
اس بستی کی سنوائی نہ کل ہونڑی نہ آج

میں تیری نظم نہیں ہوں

گماں نہ کر! کہ تو مجھے مصرعوں میں ڈھال سکتا ہے
مجھ میں پھیلے ہوئے صحرا کی ریت سمیٹ سکتا ہے
یا مری آنکھ کے دریا کو لفظ کے کوزے میں قید کر سکتا ہے
تو چاہے عمر بھر مرے رنگ چن چن کر من پسند تصاویر بناتا رہے
اور اپنے ادھ کچرا خیالات کی داد پاتا رہے
مگر اے کم ہنر! میری تصویر کے بے شمار رنگ ترے تصور سے ماورا ہیں
مجھے افسوس نہیں! کہ تو اپنے بھائی کی طرح جنگِ عظیم دوم میں دشمن کے کام نہ آ سکا
تیری دانشوری پلاسی کی شرمناک شکست میں دشمنوں کو نیست و نابود کر دینے کا کوئی اعلی منصوبہ بنانے سے قاصر رہی
اور تیری نام نہاد فیاضی بوسنیا کے بدترین قحط میں دم توڑ گئی
مجھے قطعاً افسوس نہیں کہ تیری دولت تری احتیاجات کی تشفی کر سکی نہ تری سیاست انسانی اغراض کی تسکین کا ذریعہ بن سکی
نہ تیرا خدا تجھے امان دے سکا
اور نہ ہی تری محبت ترے ادھورے پن کی تکمیل کر سکی

میں
ازل سے تیری ادھ کچرا نظمیں سننے کی عادی ہوں
یہ جانتے ہوئے بھی کہ تو مجھ سے اپنی ناتمامی کا انتقام نہیں لے سکتا
اور تا ابد مجھے نظم نہیں کر سکتا

آزادی

رستے میں پڑے روڑے پتھر
پہرہ دیتے وردی والے
دور سے آتا شور شرابا
نکڑ پہ پڑی خالی بوتل
کار کے نیچے سوتا کتا
اور غبار اُڑاتی ہوائیں
سب کچھ اچھا لگتا ہے
جب چلنے کی آزادی ہو

عشق...

Dedicated to the amazing lady Emily Bronte

ہواہو ایملی (Emily) تم اور!
ہواؤں کو تو ساری داستاں معلوم ہوتی ہے
وہ مٹی خاص ہوتی ہے کہ جس پہ عشق کی بارش برستی...
جذب ہوتی ہے
جہاں بے داغ سبزہ پھوٹتا ہے نرم
پاکیزہ
جہاں پر آرزو کی باوضو کلیاں چٹکتی ہیں
ہوا تو چھو کے خوشبو کا بدن محسوس کرتی ہے
ہوا کا لمس تو گم گشتہ جوہر ڈھونڈ لیتا ہے
مقدس عشق کی مٹی! ستودہ اور

خوابیدہ
کسی کا رنگ جب اپنی تہوں میں گھول لیتی ہے
چھڑایا جا نہیں سکتا، مٹایا جا نہیں جا سکتا
ہواہو جانتی ہو تم یہ ساری رنگ آمیزی

یہ مٹی اک دفعہ منسوب ہو جائے کسی سے گر
تو بیچی جا نہیں سکتی، خریدی جا نہیں سکتی
حضورِ عشق میں رکھ کر قدم دل سیکھ لیتا ہے
سرِ تسلیم خم کرنا
یہاں اک پل کی غفلت، اک ذرا سی جنبشِ ابرو
زمینوں آسمانوں میں دراڑیں ڈال دیتی ہے
غرض کا بیج اس مٹی میں بویا جا نہیں سکتا
ہوا ہو جانتی ہو میری فطرت
بھید میرے تم

آپ کے لفظوں کی ناک بہتی ہے

ہر چمکتا لفظ سونا نہیں ہوتا
مگر
ہر دکان بکری کی غرض سے کھولی جاتی ہے
فاضل مقرر!
آپ جب سوٹڈ بوٹڈ لہجے میں
کلچر اور آرٹ، زبان اور مذہب!
ملکی اور بین الاقوامی معاملات پر گرم فقرے اچھالتے ہیں
تو جدیدیت کا آزمودہ منجن آپ کو اپنے پیلے دانتوں کی نمائش سے نہیں روک سکتا
فاضل مقرر
جب آپ لڑکیوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے
انہیں تخلیق
اور توفیق کا منبع قرار دیتے ہیں! تو اگلی صف میں بیٹھی بانجھ اور بوڑھی عورت
آپ کے لفظوں کی ناک بہتی ہوئی دیکھ سکتی ہے
جی ہاں آپ کے لفظوں کی ناک بہتی ہے
اور اس نزلے کا علاج
ابھی مغرب میں بھی دریافت نہیں ہوا

ہزارداستاں

سناوُ اپنی ذات سے جڑی ہوئی کہانیاں
وہ شوخ رنگ روح پر نشان چھوڑتے ہوئے
گلال، سبز، جامنی
سیاہ داغ
جسم و جان پر کثیف نقش گوندھتے ہوئے
چھنن، چھنن
دھنن، دھنن
سمے کی تیز تھاپ پر تھرک کے ناچتی
تھکی ہوئی پری کہو
گلاب پاش میں مہک سی کیوں لہو کی آ گئی؟
وہ گھنگرووٗں کے شور سے لرزتی کانپتی ہوئی زمین یک بہ یک کہاں گئی
کہاں گیا تماش بین آسماں
محبتوں کے نام پر
وہ رہ بدلتے حادثے
وہ ایک ایک موڑ پر
ادھیڑ بن

اذیتیں

لباس چیرتی ہوئی ہوا کی سازباز میں شریک بھوت اور دیو
چڑیلیں اور کٹنیاں
سہلیوں کے بھیس میں وہ سازشی بلائیں اور
گلاب زادیوں کے تن بدن کو نوچتے
کریہہ شکل باغباں
تمہاری چیخ کی خوشی میں رقص کرتے بوز نے
تمہارے غم میں چور چور پاک باز بیبیاں
کہاں گئیں وہ ہم رکاب بے بسی کی پتلیاں
وہ مرشدی کے باب میں بلا کی خوش گمانیاں؟
سناو اپنی ذات سے جڑی ہوئی کہانیاں
دکھاو اپنا ہاتھ!
اس کی خوش نما لکیر میں
کہاں سے صبر کاٹتا ہے
خودکشی کا راستہ!

...نقشوں پر بنے ملک

کچھ محل صرف ہوا میں بنائے جاتے ہیں
اور کچھ ملک صرف نقشوں پر
کچھ معاہدے کیے جاتے ہیں
جلد یا بدیر توڑنے کے لیے
صداقت کی چنگاری جز وقتی سچ کو نگل بھی لے تو
خود فریبی کا جہنم دہکتا رہتا ہے
ماضی گواہ ہے
خود فریبی بڑے بڑے خطوں کو کھا گئی
بلا شبہ!
قومیں تاریخ نہیں
مستقبل رقم کرتی ہیں
کچھ قوموں میں فرد اور قبیلوں کو بھینٹ چڑھانے کی رسم آج بھی زندہ ہے
نئے اور پرانے آقاؤں کی خوشی کے خاطر
مگر
آقاؤں کی خوشی
ابتدائے آفرینش سے زیرِ تعمیر ایک سڑک ہے

جس کا آخری سرا جیتے جی نہیں ملتا

اے مرے ہم مشرب!

حقیقت زہر کا وہ پیالہ ہے

جسے مرنے سے بہت پہلے ہی نوش کرنا پڑتا ہے

بانسری

بانسری
تیرے سُر!
معبد کی خواب ناک گھنٹیوں کی طرح
موت اور زندگی کی شاہراہ کو دھندلانے والے
اُس راستے تک جاتے ہیں
جو آنے والے کل کو بیتے ہوئے کل سے ملاتا ہے
آگاہ کرتے ہیں
ماریانا ٹرانچ جیسی کھائی سے گہرے! اور
بحرالکاہل کی پاتال سے زیادہ اتھاہ محسوسات سے
تیرے سُر!
سماعت کی گلیوں میں بسنے والے ناقابل بیان دکھوں تک رسائی رکھتے ہیں
تیرے سُر!
گمشدہ مسّرتوں کا سراغ ڈھونڈ لاتے ہیں
یہ باور کروانے کے لیے کہ میرے دل میں ایک مرد کی محبت
جون کی دوپہر سے زیادہ گرم
بارش سے زیادہ گیلی اور

سردیوں کی دھوپ سے زیادہ لطیف ہے
تیرے سُر
میرے زوال آمادہ جسم کی اندھیر نگری میں
روشنی کی صورت گھُل کر
کسی لازوال شے سے ہم آمیز ہوتے ہیں
جیسے ایک راز داں دوسرے راز داں سے!

گیت

سکھی نر جل گھمس انگنا گھٹا برسی، سمے بدلا
سکھی من کے اندھیروں میں جلے دیپک، بدن اجلا
نہ پگھلا جھمکے بالی کا، مہا دھن رات کا پگھلا
لگی مہندی، چڑھے کنگن، بندھی جھانجر، کھلا جوڑا
سَرَت اگنی میں جل اٹھے ملن کی دو برَن سائے
سکھی پی رین گھر آئے
سکھی آکار پریتم کا، ہو جیوں اوتار پربھو کا
دھلے سب پاپ سیوک کے، موہے مکتی ملی دیوا
جیوں نس دن بنی داسی شری کے نام کی مالا
کرے کاہے سلونی اور کسی کرتار کی سیوا
وہی اک دیوتا ساگر میں نیا پار لنگھائے
سکھی پی رین گھر آئے
سکھی ری پیا سے ہونٹوں کو لگا امرت بھرا پیالہ
پیا کے نرم ہاتھوں نے موہے بانہوں میں یوں جکڑا

کبھی چٹکی بھری گالھو، کبھی پلّو مورا کھینچا
لکھی سنگت کے شبدوں سے مدھر سنجوگ کی بپتا
کہاں توڑے سے ٹوٹے جب لگن کی گانٹھ پڑ جائے
سکھی پی رین گھر آئے

انتقام

ایک سایہ
نیند کے کچے مکانوں میں
رات کی تاریک آنکھوں میں
پنکھے کے گدلے پروں کے دائروں میں
اور ادراک کے سونے رستے پر میرے ساتھ
خاموشی سے چلتا رہتا ہے

منڈلاتا رہتا ہے
مرے بزرگوں کی ضعیفی پر...
ان کی کمزوری، بیماری اور ویرانی کی سرحد پر

کچن میں رکھے چھری چاقوؤں
چولہے میں بھڑکتی آگ
...اور مشینوں میں دوڑتے کرنٹ میں
سرسراتا رہتا ہے

اس کی نحوست
بچوں کے بنکر کے اطراف

لنچ باکس میں
پانی کی بوتلوں میں
چاکلیٹ کی مٹھاس کے اندر محسوس کی جاسکتی ہے

مجھے ڈر ہے
میری چیخ کو پسینے میں نہلانے کے لیے

وہ
میرے خوف کی پشت پر سوار ہو کر میرے بلینکٹ میں گھس آئے گا

وقت کی بدشگون آنکھیں...
کمرے کے اندر
گھر کے باہر
گلیوں کے آس پاس
شہر کے اطراف اسے ٹہلتا دیکھتی رہتی ہیں
کسی آدم خور درندے کی طرح
ہوس میں دم ہلاتے ہوئے

اپنے ماں باپ، عزیزوں اور بچوں کو اس سے دور رکھنے
میں اگر اپنے حسن کی بلی دے بھی دوں تو
وہ ہماری موجودگی سے انتقام ضرور لے گا
اپنے نہ ہونے کا انتقام

سماں باندھو

سماں باندھو
کہ شب کی سرد خلوت میں اترتی نیند کی پریاں
کوئی اچھا شگن لائیں
سمے کی بوڑھی آنکھوں میں شرابِ غم بھی ہے لیکن
لطافت خواب کی لائیں

مرے ہاتھوں میں اپنے ہاتھ دو
پلکوں پہ بوسہ دو
سرابوں سے کئی منظر چراتی گرم جوشی کو ابھی مت سرد پڑنے دو
نجانے کس گھڑی کس پل
دلوں میں آگ روشن ہو
حقیقت کی حسیں دیوی ہمیں عریاں نظر آئے
ہمیں تابِ نظارہ ہو
ہمیں اس کیفت میں رقص اندر رقص کرنا ہے
سماں باندھو!
کہ ناچے توڑ کے بیرون کی زنجیر ہر لمحہ

کہ آزادی کا دھن برسے
درونِ دل ہر اک تاریک گوشہ جھلملا اٹھے

سماں باندھو!
ہے مد و جزر کی یہ آخری ساعت
خمارِ آرزو اب دھیرے دھیرے ختم ہونا ہے
بنامِ خواب و بیداری
ابد آثار رخصت کا قرینہ جاننے والی ہوا کے نرم سینے پر
ہمیں سر رکھ کے سونا ہے

کراچی ہوں

کراچی ہوں
میں اپنی چاک دامانی کا قصہ
خون سے اپنے لکھوں
اور کھارے پانی میں بہا دوں
آنسوؤں کی بے ثباتی کو
کناروں پر سفینے ڈوبتے دیکھوں
دلاسا دوں تو کیسے دوں
مچلتی، سر پٹکتی، ٹوٹتی بے تاب لہروں کو
کہ میرے حرف پر بندش میری سانسوں پہ پہرے ہیں
مری اس خاک میں پیوست
بوٹوں کے نشاں اب اور گہرے ہیں
بھنور ہے، شور ہے اور تندیٔ موج ہوا!!!
جیسے کہ بالکل بے خبر ہے ظرف سے میرے
کراچی ہوں
میرا سینہ سمندر ہے
میں آنے والوں کو رستہ، نمک، تسکین دیتا ہوں

میں صحراؤں، جزیروں، جنگلوں، دریاؤں کا داتا
یونہی بھرتا رہوں گا خواب کے کشکول روز و شب
کسی سائل کو کیا پروا
اگر زخمی ہوں تنہا ہوں

گیت

شہد ہے وقت کے نقرئی جار میں
ذائقے دار ہے رات کی امرِتی
فصل گندم کی تیار ہے!
بھوک ہے
من کی وحشی دِواروں سے چمٹی ہوئی زرد رُو اشتہا!
سبز ہونے کو بے تاب ہے! بے طرح
سر پٹکتی ہے سانسوں میں پیاسی ہوا
آؤنا، آؤنا، آؤنا، آؤنا

لاؤنان جویں خلوتِ خاص میں
خواب کی سرخ مے اور چھلکاؤنا
آؤنا!
آس کے باغ میں ناچتا ہے مگن مور آواز کا
دھن دھنا دھن دھنا، دھن دھنا دھن دھنا
آؤنا، آؤنا
کتنی منہ زور ہے چاہ تکمیل کی
چاٹتی ہے لہو بے طرح تشنگی

اس دھند لکے میں لپٹا ہوا اک یقیں!

اک گماں!!

نظم ہو؟ گیت ہو؟ جو ئے تخلیق ہو؟

تلخ لذّت میں ڈوبا ہوا حرف ہو؟

جو بھی ہو!!!

پاٹنا ہے تمھیں اک اندھا خلا

آ ؤ نا.... آ ؤ نا.... آ ؤ نا

آ ؤ نا!!!....

بزدلو... (سانحۂ پشاور کے حوالے سے لکھی گئی نظم)

تم بھی کیا لوگ ہو بزدلو!
اپنے بچوں کی لاشوں کی تاریخ لکھنے کی ہمت کرو
اس سیہ باب میں خود کو اندھا لکھو
تم نے دیکھی نہیں آگ تہذیب کے سرخ پتوں کے نیچے سلگتی رہی
تم نے دیکھی نہیں موت عفریت کی شکل میں سالہا سال پہلو میں پلتی رہی
آخرش دل میں قبریں بنا دی گئیں
خود کو بہرا لکھو!
وقت آواز دیتا رہا تم مگر اک اشارہ بھی اس کا سمجھتے نہ تھے
اپنی حالت کو ہرگز بدلتے نہ تھے
تم جو متروک لفظوں کو چنتے رہے خود کو گونگا لکھو
اپنے بچوں کی لاشوں کی تاریخ لکھنے کی ہمت کرو
اور لکھو! تم نے جھوٹے خداؤں کو سجدے کیے
اور شیطان مضبوط ہوتا رہا
حرص اور اشتہا کی بقا کے لیے گرم تازہ لہو بھینٹ چڑھتا رہا
سانپ انڈے نگلتا رہا اور تم؟ تم میں چڑیا کی جتنی بھی ہمت نہ تھی
بزدلو! خاک مذہب، سیاست، تجارت، تمدن کی کب تک اُڑاؤ گے تم؟
اپنی نسلوں کو کیا منہ دکھاؤ گے تم؟

وقت کے پاس گروی رکھی آنکھ سے...

وقت کے پاس گروی رکھی آنکھ سے
آئینہ دیکھ کر کون مسرور ہو
کون متروک لفظوں سے نظمیں لکھے
کون حرفِ ستائش پہ ممنون ہو
ہو تفکر کہاں کس جگہ خیمہ زن؟
جب طنابیں زمیں کی ہوں اکھڑی ہوئی
کیسے شبدوں میں سمٹے خلاؤں کا غم
رات اور دن کے بوسیدہ زندان میں
کون بجھتے ستاروں سے محظوظ ہو
کیوں تخیل کی بازی گری میں رہے
میرا امکان بن کر مری بے بسی
شام بے گھر ہے اور بادلوں کا فضا میں ٹھکانہ نہیں
نقش بر آب ہے موج انفاس کی
ایک بیتے ہوئے خواب کے سائے میں
جھیلتی ہے مجھے میری موجودگی

❁ ❁ ❁

زنجیروں کے درمیاں

میں نے ہر رنگ

ہر دھات

ہر قیمت اور ہر قسم کی زنجیروں سے محبت کی ہے

کیوں کہ میرے بچپن کو کوئی اور کھلونا میسر نہ تھا

اور نہ میری جوانی کو

کوئی اور محبوب

لیکن کبھی بیداری اور نیند سے لپٹی ان ہزار ہا زنجیروں میں سے

کسی ایک کو چننا پڑے

تو میں آزادی کی زنجیر کا انتخاب کروں گی

سراب کی حقیقتیں

سمندروں کے دیوتا
تھکے ہوئے پجاریوں کو پیاس کا کوئی سرا دکھائیں گے؟
کہ آگہی کو واہمے کی سوت میں ہی گانٹھ لیں
......گرہ جو واہمے کی اک لگائے سے نہیں لگے!
تو کیا کریں؟
کہ بابلی مُنار کے الوہی سائے میں رکھے ہوئے
غلام اور باندیوں کی بے خطا ہتھیلیوں میں بارشوں کے پانیوں نے راستے بنا لیے
مگر وہ اپنی اوک سے نہ ایک گھونٹ بھر سکے
تو خشک ہونٹ جو گنہ کے ذائقے سے ڈر رہے ہیں، کیا کریں؟
حیاتِ سبز رنگ کو سجا کے قاش قاش وقت کے طلائی طشت میں چنا گیا
مگر کہیں خداؤں اور مجاوروں کی زرد چشم اشتہا مٹی بھی ہے؟
تمام دن گزر گیا
فلک کے قصر کی مہیب راہ داریوں میں شام بھی اتر گئی
دیے کی تیز لو سے کھیلتی ہوئی ہوا
نقاب تیرگی کا گر بلا لحاظ کھول دے
تو روشنی کے آخری مبالغے کا کیا بنے؟

بہلاوا

ہوسکتا ہے
اس منظر سے دھوپ نکل کر
چھاؤں پر قابض ہو جائے
سورج کی ست رنگی کرنیں
دھبوں میں بٹ جائیں
وقت کا گرگٹ رنگ بدل لے
ساری بستی
دیوتاؤں کو آنکھیں اپنی دان میں دے کر سو جائے
لیکن!
بہلاوے کی پہلی بارش پڑنے دو
ہوسکتا ہے
پتھر سے خوشبو پھوٹے
اور خوشبو سے انگارے
ہوسکتا ہے انگاروں میں جل جل کر
مٹی بھی کندن ہو جائے

❁ ❁ ❁

رقص

مرے قریب رک چکی ہے نبضِ کائنات بھی
ہے پرتوِ ممات اب یہ رشتۂ حیات بھی
رہا عجیب التواء کہ جاں بلب ہے ہر صدی
جمود کا شکار ہے الم مرا، خوشی مری
خیال ہیں نہ خواب ہیں جمال ہے نہ روشنی
تمدن و طریق بن گئی ہے پارسائی بھی
یہ جبر ہے کہ بندگی؟ یہ عیب ہے کہ زندگی؟
بہار ڈھونڈتی پھرے نشاطِ رنگ و بو یہاں
یہ طرز یہ چلن مٹا! کہ ہم نہیں فرشتگاں
فنون جاوداں جو رنگِ روح کو نکھار دیں
ہنر وہ دے، وہ آگ دے! وہ جبیں وہ آستاں
بقا کا ساز چھیڑ دے! یہ دن فنا کے پھیر دے
ہے بے ثمر یہ مستقل تو ارضِ دل کو خیر دے
یہ بحرِ موج جھومتی ہے دیکھ اضطراب میں
تھی کن فکاں کی جو صدا وہ تھی اسی حباب میں
پئے دوامِ زیست ہے یہ ناچتا ہوا لہو

یہ کہکشاں کا وصف ہے خلائے بے حساب میں

تو رقص کر کہ جاگنے لگے یہ خطۂ زمیں
کھلے وہ بابِ دل ربا جو فکر پہ کھلا نہیں
تو رقص کر جلو میں لے کہ دو جہان ہم نشیں
یہ سلسلہ دھمال کا ازل سے. ہے رکا نہیں
تو رقص کر کہ دھڑکنوں کا زیر و بم لگے حسیں
ہو وجد و کیف وہ عطا وہ حظ جو کھو کھلا نہیں
تو رقص کر کہ گھنگرؤں سے آشنا ہو یہ زمیں
ہرا ہو فرشِ آگہی جو دور تک ہرا نہیں
تو رقص کر کہ آس کا دیا کوئی جلے کہیں
وہ داغِ دل بھی دھل رہے جو مدّتوں دھلا نہیں
تو رقص کر کہ فجر کا، زوالِ شب کا ہو یقیں
خوشا یونہی ملے خدا جو آج تک ملا نہیں.

ڈر

کیسے نکلے گا جیتے جی دل سے ڈر کا کانٹا صاحب
کب خوف کی وحشی گلیوں میں بھٹکی ہوئی ساعت لوٹے گی؟
کب اندیشوں کے سانپ مرے پیڑوں سے لپٹنا چھوڑیں گے
سہمے ہوئے شبدوں کو اپنے سینے سے لگائے بیٹھی ہوں
کیسے بتلاؤں کیوں مجھ کو دن کے زہریلے ہاتھوں سے
شاموں کے سرخ آسیبوں سے، راتوں کی بے دل آنکھوں سے
اور آس کے آٹھوں پہروں سے
ڈر لگتا ہے
خوابوں کے رن میں پڑے ہوئے خواہش کے ادھورے جسموں سے
اور مان کی روح میں گڑے ہوئے تر پنجوں سے
جانی پہچانی آنکھوں میں پنہاں انجانی وحشت سے
رشتوں کے مذبح خانوں سے
بندھن کے زندہ لاشوں سے
ڈر لگتا ہے
اس جسم کی دیواروں میں ہے ڈر کا خستہ گارا صاحب
شیشے میں رقصاں سایوں سے، سانسوں اور آوازوں سے

پل پل میں بدلتے رنگوں سے! ڈر لگتا ہے
نیلی پڑ جاتی ہوں صاحب......................
چہرے کی پیلی رنگت کو کب تک میں چھپاؤں غازے میں؟

ہمیں اب کوچ کرنا ہے

شفق پھوٹی چھلکتے سات رنگوں سے کٹورا بھر گیا دن کا
زمیں مٹیالے ہاتھوں کی حرارت تاپنے جا گی
مرے بچے! ہمیں اب لوٹنا ہو گا
گھنے پیڑوں کے سائے میں
جہاں بھیڑوں کے ریوڑ کو قناعت چست رکھتی ہے
جہاں مچھلی بھی کائی بھوک سے زیادہ نہیں کھاتی،
گلہری کے لیے اخروٹ کا چھلکا بھی کافی ہے
درختوں پر جہاں پنچھی بسیرا کرتے ہیں، قبضہ نہیں کرتے
جہاں ہے برلبِ موج ہوا اک لحن آزادی
متاعِ روح آزادی
نشاطِ اصل آزادی
جہاں پھولوں کو بے پردا بھی کھلنے کی ہے آزادی
ہمیں ان سبزہ زاروں کیطرف اب کوچ کرنا ہے
مرے بچے! جہاں ہم آن نکلے ہیں یہ منڈی تاجروں کی ہے
یہاں چہکار چڑیوں کی، چمکتے تتلیوں کے پر کوئی قیمت نہیں رکھتے
سمندر کا کنارہ، سیپیاں، دم توڑتی لہریں

بھگوتی ہی نہیں پلکیں!
منافع پر نظر رکھتی ہیں کاروبار کی آنکھیں
دھڑکتے پانیوں کی لے نہیں سنتے ہیں بیوپاری
یہاں تہذیب کی، تاریخ کی اور تخت کی قیمت
فقط اک کھوٹا سکہ ہے
یہاں انسان کیا شے ہے خدا بے مول بکتا ہے
تو اس سے پیشتر سودا ہمارا طے کیا جائے
ہمارا کل اثاثہ کوڑیوں کے دام بک جائے
ہمیں اب کوچ کرنا ہے!!!!

آئی وش

کاش میں پلومیریا ہوتی
شفاف اور بے داغ پھول
دن میں دھوپ نہاتی اور رات بھر چاند کی کرنوں سے اٹکھیلیاں کرتی
میرا کوئی مذہب ہوتا، نہ زبان، نہ فرقہ، نہ رواج
کاش میں زمینوں، پانیوں، فضاؤں اور ذہنوں کو کاٹنے والے سازشیوں کے قبیل سے
نہ ہوتی
میں بھی عصبیت، وطنیت اور تعصب سے پاک
باوضو آنکھوں کے لیے ایک تحفہ ہوتی
بطور اشرف المخلوقات اس خوبصورت سیارے کی تباہی کا باعث بننے کے بجائے
میں ایک بے ضرر پلومیریا ہوتی
جس کی تخلیق کا واحد مقصد
کائنات کے حسن میں اضافہ کرنا
مسرّت باٹنا، فرحت اور تازگی بخشنا
اور ہوا کی ہتھیلی پر خوشبو کی نظم لکھ کر
رخصت ہو جانا ہوتا...

❁ ❁ ❁

غزلیں

✿

خوشبو سے تیری ہاتھ ملانے کا شوق ہے
پھر اس کو دو جہاں سے چھپانے کا شوق ہے

آنکھیں ہوں، خواب ہوں کہ شکستہ عمارتیں
ہر اک کھنڈر میں دیپ جلانے کا شوق ہے

کچھ دیر اپنے ساتھ بھی رہنے دو اب ہمیں
اس روشنی کو آئینہ خانے کا شوق ہے

اظہار، آس، شوق، تماشا، فسردگی
کیوں دل کو اتنا بار اٹھانے کا شوق ہے

ہجرت ازل سے ہے مرے اجداد کا شعار
مجھ کو بھی ایک ناؤ بنانے کا شوق ہے

کیوں ہم یہ بات بات پہ دینے لگے جواب
اُن کو تو خیر بات بڑھانے کا شوق ہے

اک نور ہی تو سارے تخیل کی جان ہے
اور اس پہ ہم کو رنگ جمانے کا شوق ہے

ہر ایک کو صنم ہو، خدا ہو، کہ آدمی
ماتھے پہ میرے داغ لگانے کا شوق ہے

برباد ہوتے جائیں گے جتنا کرو گے تم
ہم کو تمھارا ہاتھ بٹانے کا شوق ہے

نیناؔ انہی کی سمت سفر کر رہی ہوں میں
رستے میں جن کو دھوپ بچھانے کا شوق ہے

✿

ہم ایسا تو اور کوئی خوابوں کا قیدی بھی نئیں ہے
بھیگ رہے ہیں اُس بارش میں اب تک جو برسی نئیں ہے

بھید سمندر کھول رہا ہے اک نازک سی لڑکی پر
کتنی موجیں ٹوٹ رہی ہیں پیروں میں، گنتی نئیں ہے

لَو دکھلاتی اُس کی آنکھیں بولیں دھیمے لہجے میں
دیکھ بجھائی جا سکتی ہے آگ ابھی بھڑکی نئیں ہے

جانے کیسے میں اور وہ اک دوجے میں گھُل گئے دونوں !
سچ پوچھو تو اپنی اُس سے ایسی کوئی بنتی نئیں ہے

آنگن میں بیٹھی بڑھیائیں سوچ کے یہ کانپ اٹھتی ہیں!
چلتی ہے جب تیز ہوا تو روکے سے رکتی نئیں ہے

پتھر ہو گئے رم جھم نیناں، دور کہیں او بسنے والے
شور مچاتے دریا میں اب اک قطرہ پانی نئیں ہے

❀

محبت میں عبادت کا تصوّر لازمی لاؤ
بدن آدھی گواہی ہے شہادت روح کی لاؤ

بدن کی آیتیں پڑھ کر فراموشی گنہ بدتر
تمھیں ایمان لانا ہے تو مجھ پر دائمی لاؤ

مری مٹی کی دہری ہجرتوں کا بانٹنے کو غم
نہیں ملتا اگر دریا تو کوئی دشت ہی لاؤ

ارے!! تم نے نہیں دیکھا ستارے ساتھ ٹوٹے تھے
اگر پھر دیکھنا چاہو تو آنکھوں میں نمی لاؤ

مقدس ہیں صحیفوں کی طرح یہ جاگتی آنکھیں
تلاوت کے لیے ان کی طہارت سرمدی لاؤ

ذرا سی موج لے کر آدمی کو ڈوب جاتی ہے
سمندر میں اترنا ہے تو کشتی نوح کی لاؤ

سبھی پہلے پہل ملتے ہیں بے حد گرم جوشی سے
ہمارے سامنے اپنا رویہ آخری لاؤ

آپ کے دل پہ ہے حکمرانی مری
جان لے لے گی یہ خوش گمانی مری

عشق ریشم کا دھاگہ تھا کھلتا گیا
درد بُنتا گیا رایگانی مری

میں ترا گھر بنانے میں مصروف تھی
مجھ پہ ہنستی رہی بے مکانی مری

چشم در چشم پڑھیے فسانے مرے
خواب در خواب لکھیے کہانی مری

آہ کہتی نہیں تھی مر ا واقعہ
اشک کرتے نہ تھے ترجمانی مری

❀

خوابوں کا کوئی سرا نہیں ہے
ہے بھی تو مجھے پتا نہیں ہے

تا دور غبار اڑ رہا ہے
ہونے کو تو کچھ ہوا نہیں ہے

پھر رات کی سرزمیں ہے میں ہوں
اور ہاتھ میں پھر دیا نہیں ہے

اک خواب کی لَو ہے چشمِ تر میں
تصویر میں کچھ نیا نہیں ہے

بیدار ہیں شہر کی ہوائیں
وہ شخص ابھی گیا نہیں ہے

صحرا میں گھٹا برس رہی ہے
یہ وقت لیکن مرا نہیں ہے

سانسوں میں کسک ہے اجنبی سی
اس نے تو ابھی چھوا نہیں ہے

میں وقت سے چل رہی ہوں آگے
تا دور کوئی صدا نہیں ہے

سرشار ہوں شعر کہہ کے نیناؔ
کچھ اور اگر صلہ نہیں ہے

❀

رقصِ جنوں ہے زندگی، دل ہے سرودِ سرکشی
اس تشنگی میں گم ہوئے کتنے خُمِ آسودگی

وہ رات کی آغوش میں مدھم ستارہ خواب کا
کرتا ہے گاہے تیرگی، دیتا ہے گاہے روشنی

اے یارِ من، اے دل ستاں، اس آبسالِ دہر میں
ہے تجھ سا کوئی آشنا نے کوئی تجھ سا اجنبی

آب و ہوائے عشق وہ جس میں نہائیں بارشیں
سینکے ہے جس کو دھوپ خود، ہے آگ جس کو تاپتی

یا رقص اندر رقص ہو، یا نغمگی در نغمگی
یا بات جیسی بات ہو یا خامشی سی خامشی

ہم خواب زاروں میں بسے ہیں دو جہاں سے بے خبر
کیا دوستوں سے دوستی، کیا دشمنوں سے دشمنی

لفظ وبیاں کے درمیاں اک رنگِ ناتمثال میں
روحِ وفا کا کرب ہے نیناؔ کی ساری شاعری

خواب سے روشنی کا سرا لوں گی میں
اور اندھیرے میں رستہ بنا لوں گی میں

اک نگہ آج موسم پہ ڈالوں گی میں
رنگ ساتوں دھنک کے چرا لوں گی میں

جانتی ہی کہاں تھی مری اشتہا
بھوک کی فصل خود میں اُگا لوں گی میں

آزماتا ہے مجھ کو خدا ! با خدا
ہاتھ جیسے دعا سے اٹھا لوں گی میں

آپ دیتے ہیں دنیا کی لالچ مجھے
مفت بھی یہ ملے تو بھلا لوں گی میں

ناگہاں دو جہاں زیرِ پا آ گئے
کیسے کانٹے یہ نیناؔ نکالوں گی میں

ہر ایک حرف ہو امکان ! تیرے جیسا ہو
مری کتاب کا عنوان تیرے جیسا ہو

ہزار بار گوارا ہے پارسائی کو
جو میری ذات پہ بہتان تیرے جیسا ہو

کوئی سوال جو مشکل نہ ہو ترے جیسا؟
کوئی جواب جو آسان تیرے جیسا ہو ؟

میں عمر قید بصد ناز کاٹ سکتی ہوں
اگر نصیب میں زندان تیرے جیسا ہو

محبتوں کا صلہ ہو تو ہو ترے جیسا!!
محبتوں میں ہو نقصان، تیرے جیسا ہو

مجھے قبول ہے، بارِ دگر عنایت ہو
مگر یہ شرط ہے احسان ترے جیسا ہو

شفا بھی دیتا ہے یہ معجزہ محبت کا
کسی مریض کا ایمان تیرے جیسا ہو

❀

غروب مہرِ جہاں تاب ہونے والا ہے
یہ سب فریبِ نظر خواب ہونے والا ہے

جو تھا وہ نادر و نایاب ہو گیا اور اب
جو ہے وہ نادرو نایاب ہونے والا ہے

یہ گرم جوش ہواؤں کا آخری نوحہ
ہمارے سوگ میں برفاب ہونے والا ہے

ہم ایسے گام پہ دریائے خوف میں ہیں کہ اب
شعور لقمہ ء گرداب ہونے والا ہے

یہ پشتہ بندی مگر کس کے کام آئے گی
ہر ایک اشک تو سیلاب ہونے والا ہے

❁

بوجھ اپنا سہارتے ہیں ہم
کون سا تیر مارتے ہیں ہم

آنکھ کے پار کس خموشی سے
ایک دریا اتارتے ہیں ہم

اور ہنستا ہے آئینہ ہم پر
اور خود کو سنوارتے ہیں ہم

ہر نئی شام اپنے پہلو میں
ایک سائے کو مارتے ہیں ہم

کوئی بھی تو نہیں ہے! کوئی بھی
جانے کس کو پکارتے ہیں ہم

دے کر فریب پیاس کی آزردگی کو ہم
آؤ نا ! گھونٹ بھر کے پئیں زندگی کو ہم

کھلنے لگی ہے نیند کی بھیدوں بھری کتھا
چھونے لگے ہیں خواب کی دل بستگی کو ہم

صحرا قبول کرتا ہے بارش کا عندیہ
مٹی میں گوندھ لیتے ہیں جب تشنگی کو ہم

رکھ کر ہزار آئینے اِس رخ کے روبرو
دھوکہ دیا کریں گے تری سادگی کو ہم

رقصاں ہے بوزنوں کی طرح وقت بے تکان
تکتے ہیں پتلیوں کی طرح ڈگڈگی کو ہم

اندر ہی اپنے خاک اڑاتے ہیں دور تک
باہر نہیں نکالتے آوارگی کو ہم

حاجت کے دام گرتے نہیں ہیں نقاب میں
یعنی حجاب کرتے ہیں بے پردگی کو ہم

سنتا تھا بے کنار سمندر ہماری نظم
اوروں کو بھی سناتے رہے دل لگی کو ہم

لفظوں کی میزبانی اگر سونپ دی گئی
مہماں کریں گے آپ کی سنجیدگی کو ہم

❀

اورے سوالی بول سخی ہو گا اس کے جیسا کوئی؟
تیرا کاسہ بھرتے بھرتے خالی ہو بیٹھا کوئی !!

جانے جی میں آئی کیا! خود پاؤں میں ڈال لیا پھندا
تجھ کو پنچھی جال بچھاتے دیکھتا رہتا تھا کوئی !

من بھیتر جلتی بتیاں اور جاگنے لگتی تھیں رتیاں
دھیمے سروں میں گیت ملن کے ایسے گاتا تھا کوئی

اے قصہ گو ! ساری کتھائیں تیری سن لی ہیں ہم نے
تجھ سے بڑھ کر جھوٹا ہے اور نا تجھ سا سچا کوئی !

اس کے محل میں گونج رہا تھا جب مقتل کا سناٹا !!
شہزادی کے ماتھے پر کیا تم نے بل دیکھا کوئی ؟

سب کو بھول کے دو سائے یوں اک دوجے میں سمٹ گئے
جیسے خواب ہو جگ سارا، جیسے جیون سپنا کوئی

بے کلی سی ہے! کیوں ہے
اک کمی سی ہے، کیوں ہے

آہ کی طوالت بھی
عارضی سی ہے کیوں ہے

دھوپ تیرے لہجے کی
شبنمی سی ہے، کیوں ہے

ناؤ زندگانی کی
کاغذی سی ہے کیوں ہے

شبد کے اندھیرے میں
روشنی سی ہے کیوں ہے

دشت کی ہوا نیناؔ
ساحلی سی ہے کیوں ہے

❀

ترے عکس سے مری ذات میں ہے لطیف ہجر و وصال سا
دمِ صبح کوئی امنگ سی، سرِ شام کوئی ملال سا

تری بوئے خوش کے سرور سے، تری روشنی کے وفور سے
مرے نین گہرے سیاہ سے، مرا رنگ سرخ گلال سا

مگر آگہی کی طلب سے ہے ہمہ وقت نوکِ زبان پر
کوئی لفظ لفظِ گمان سا، کوئی حرف حرفِ سوال سا

جسے زندگی کے رفو لباس کے سارے بخیے قبول ہیں
اسے پھر لبادہ قضا کا بھی ہوا نرم ریشوں کی شال سا

چلو ڈھونڈیں شہرِ نمود میں کوئی شخص پیکرِ زندگی
کوئی دوستی کی نظیر سا، کوئی دلبری کی مثال سا

مرا انتقام بھی حرف ہیں، مرا اہتمام بھی حرف ہیں
کبھی گیت گیت ترنگ سی، کبھی شعر شعر وبال سا

میں ترا درد، ترا روگ، دوا بھی تیری
سایہ بیماری مرا اس میں شفا بھی تیری

اک اشارہ جو ترے حق میں کیا جائے تو
بوئے گل، رنگِ چمن، موجِ صبا بھی تیری

خواب میں تجھ کو محبت کی بشارت ہو گی
یہ صلہ بھی ہے بیک وقت سزا بھی تیری

عمر بھر تجھ سے جو سرزد ہوا چاہتی ہے !
درگزر کر دی گئی ہے وہ خطا بھی تیری

ہاتھ رکھتے ہوئے اک دل پہ کہا جاتا ہے
چھین لی جائے گی تجھ سے یہ جگہ بھی تیری

❀

مری خوشبو مرے اسرار تجھ میں !
میں شامل ہوں جمالِ یار تجھ میں

مسیحائی کو جس کی عشق آیا
کوئی ایسا پڑا بیمار تجھ میں

غبارِ ذات بیٹھے گا کوئی دم
گری ہے آخری دیوار تجھ میں

فسونِ شب بھی ہے قربان جس پر
سخن ایسا ہوا بیدار تجھ میں !

ہوائے تند ہے، جلتے دیے ہیں
ازل سے برسرِ پیکار تجھ میں

تجھے ہے آرزو دنیا کی لیکن
کوئی دنیا سے ہے بیزار تجھ میں

ملن کے گیت گاتی ہے ازل سے
مری پازیب کی جھنکار تجھ میں

میں ہوں وہ شبد جو معدوم ہوتا
اگر پاتا نہیں اظہار تجھ میں

اضافی ہیں مجھے یہ دین و دنیا
مرے دونوں جہاں دلدار تجھ میں

ایک ذوالقافیتین اور ذوالردیفین غزل

کبھی صحرا ترا لہجہ، کبھی بارش تری باتیں
کبھی ٹھنڈا ترا لہجہ، کبھی آتش تری باتیں

یہی شیرینی و تلخی طبیعت سیر کرتی ہے
کبھی کڑوا ترا لہجہ، کبھی کشمش تری باتیں

نہیں کوئی طبیبِ دل ستم مائل ترے جیسا
کبھی پھایا ترا لہجہ، کبھی سوزش تری باتیں

اندھیرا ہے اگر ڈوبے اگر ابھرے تو سورج ہے
کبھی کورا ترا لہجہ، کبھی دانش تری باتیں

بھڑکتی بجھتی ہے پل پل چراغِ زندگی کی لَو
کبھی رسیا ترا لہجہ، کبھی رنجش تری باتیں

متاعِ زیست ہے نینا یہی غربت یہی دولت
کبھی کاسہ ترا لہجہ، کبھی بخشش تری باتیں

❁

ہم دھوپ نہانا چاہتے ہیں اور سر پر بادل کالا ہے
وہ شام کھڑی ہے چوکھٹ پر ! اک تارا ٹوٹنے والا ہے

تفسیرِ ہستی کیا ہو گی انسانی فہم کے حلقے میں
جو عقل کی مکڑی بُنتی ہے وہ فکر و نظر کا جالا ہے

لکھتے ہی شبد محبت کے اُڑ جاتا ہے کاغذ کا رنگ
کوئی کیا جانے اس منتر میں گڑبڑ کیا گھوٹالا ہے

بے رنگ سمے کی بستی میں اک دھوپ اور چھاؤں کے منتر سے
ہر صورت ہے انجانی سی، ہر چہرہ دیکھا بھالا ہے

کس جھنجٹ نے کن سوچوں نے نیناؔ تم کو الجھائے رکھا
سو کام پڑے ہیں کرنے کے اور دن بھی گزرنے والا ہے

✿

یہ مزاجِ موسمِ یار گر کبھی خوش گوار نہیں رہا
میں کروں گی کیا مرے واسطے جو وہ بے قرار نہیں رہا

کبھی سُر کے گہنے اجالنا، کبھی حرف سکوں میں ڈھالنا
تہی دست ہو رہوں باخدا جو یہ روزگار نہیں رہا

تو نے سطر سطر ذرا ذرا اسے کھولا خود پہ تو کس طرح
مرا بھید جو مری ذات پہ کبھی آشکار نہیں رہا

ذرا تیرگی ذرا روشنی ابھی اچھی لگتی ہے کچھ کمی
کئی خامیاں تو یہ دل مرا ابھی خود سنوار نہیں رہا

جہاں داغ داغ تھے رنگ و بو، جہاں خواب سارے تھے بے نمو
میں اٹھی جو نیند سے چونک کر تو وہ خار زار نہیں رہا

❀

ریا کاری کے دھندوں میں نہ تو شامل نہ میں شامل
خدا کے نیک بندوں میں نہ تو شامل نہ میں شامل

وفا کی سوکھتی جھیلوں سے لاکھوں کوچ کرتے ہیں
مگر اڑتے پرندوں میں نہ تو شامل نہ میں شامل

تماشا دیکھتے ہیں آپ اپنا اور ہنستے ہیں
ہمارے درد مندوں میں نہ تم شامل نہ میں شامل

ابھی تو بھیگتے لمحوں نے پہلا بھید پایا ہے
ابھی بارش کی بوندوں میں نہ تو شامل نہ میں شامل

فساد و قتل کرتے ہیں جو تیرے میرے ناموں پر
الٰہی ان درندوں میں نہ تو شامل نہ میں شامل

نہ اعزازات اور پی آر، تمغے اور نہ سیمینار
ادب کے شرپسندوں میں نہ تم شامل نہ میں شامل

ہے بال و پر میں وحشت سی بے سمت اڑانیں بھرتی ہوں !
اپنے اندر کے جنگل میں گم ہو جانے سے ڈرتی ہوں

پھر آس کا دریا بہتا ہے، پھر سبزہ اُگ اُگ آتا ہے
پھر دھوپ کنارے بیٹھی میں اک خواب کی چھاگل بھرتی ہوں

کیوں آگ دہکتی ہے مجھ میں، کیوں بارش ہوتی ہے مجھ میں
جب دھیان سے ملتی ہوں تیرے، جب تیرے من میں اترتی ہوں

کب مجھ کو رہائی ملنی تھی، ناحق جو قفس بھی توڑ دیا
بج اٹھتی ہیں زنجیریں سی میں پاؤں جہاں بھی دھرتی ہوں

اک پھول کی پتی کا بستر، اک اوس کے موتی کا تکیہ
تتلی کے پروں کو اوڑھ کے میں خوابوں میں آن ٹھہرتی ہوں

دل غم سے رہائی چاہتا ہے اور وہ بھی جیتے جی صاحب
پھر تجھ میں پنہ لے لیتی ہوں پھر خود سے کنارہ کرتی ہوں

ہیں ناگ کا پھن کالی راتیں، لمحہ لمحہ ڈستی جاویں
سو بار تڑپتی ہوں صاحب سو بار میں جیتی مرتی ہوں

✿

بس گھڑی دو گھڑی جھلملانے کا ڈر
اک ستارے کو ہے ٹوٹ جانے کا ڈر

دل سے گڑیوں کے تا عمر نکلا نہیں
کھیل کے بعد قیمت گنوانے کاڈر

خامشی بھید کے خوف سے زرد ہے
اور باتوں کو ہے اک فسانے کاڈر

جل اٹھی سر پھری آگ ہم میں کہیں
راکھ میں دب گیا سر اٹھانے کاڈر

سچ تو یہ ہے کہ تو سچ سنے گا نہیں
اور اس پر ترے روٹھ جانے کاڈر

بال و پر میں کہیں سو رہا ہے ابھی
آخری مرتبہ پھڑپھڑانے کاڈر

❀

بارش خوشبو رنگ ہوا ہیں میں اور تو
خوابوں کا بے نام سِرا ہیں میں اور تو

اپنا گھر ہے سات سُروں کے آنگن میں
گیتوں کی آزاد فضا ہیں میں اور تو

منّت کی اک ڈوری ہیں پیپل سے بندھی
جل میں بہتا ایک دیا ہیں میں اور تو

جس نے جنم دیا ہے ہر افسانے کو
بھولی بسری کوئی کتھا ہیں میں اور تو

ایک نویلا لفظ ہزاروں لفظوں میں
رنگوں میں اک رنگ نیا ہیں میں اور تو

✿

اس پاک و ہند میں یہی خیرا للسان ہے
اردو مری زبان مری آن بان ہے

کب تک میں گھونسلے کے لیے سانپ سے لڑوں
ستر برس کی میرے پروں میں تکان ہے

اک داغ تو زمیں کو وراثت میں مل گیا
اور ایک اس جبین پہ تازہ نشان ہے

نا آشنا ہوا ہے فضا اجنبی سی ہے
کہنے کو اپنا شہر ہے اپنا مکان ہے

دریا کے اضطراب نے کیا کچھ ڈبو دیا
بستی ایک ایک مکاں بے نشان ہے

رہنا ہے چپ کہاں پہ، کہاں بولنا ہے کچھ
نینا قدم قدم پہ یہی امتحان ہے

❀

حیرت سرائے حرف میں آؤ تو بات ہے
اور واپسی کی راہ نہ پاؤ تو بات ہے

خوشبو کے بھید کھلتے نہیں چار روز میں
پھولوں کے ساتھ عمر بِتاؤ تو باتؔ ہے
ایسے کُھلو، کھلے ہے غزل جیسے میرؔ کی
آ کر بھی یعنی ہاتھ نہ آؤ تو بات ہے

لے کر تمھارے گیت جو اترے دلوں کے پار
کاغذ پہ ایسی ناؤ بناؤ تو بات ہے

کیا لطف آئینے سے ملی روشنی میں ہے
نیناؔ دیے کی قید میں آ ؤ تو بات ہے

اجنبی ہو گئے دیکھتے دیکھتے!
اور سبھی ہو گئے دیکھتے دیکھتے

دن بھی وہ جن میں کوئی کمی ہی نہ تھی
اک کمی ہو گئے دیکھتے دیکھتے

آپ تک جانے والے سبھی راستے
داخلی ہو گئے دیکھتے دیکھتے

شاعری پہلا الزام تھی ذات پر
پھر کئی ہو گئے دیکھتے دیکھتے

رنگ جتنے بھرے میں نے تصویر میں
سرمئی ہو گئے دیکھتے دیکھتے

اُس کی صحبت میں گزرے ہوئے سارے پل
شاعری ہو گئے دیکھتے دیکھتے

ہم مہا شبد کا اولیں بھید تھے
روشنی ہو گئے دیکھتے دیکھتے

❀

سب میسّر ہے لیکن نہیں
یہ میرا گھر ہے! لیکن نہیں

اُگ رہا ہے نظر میں سراب
ایک منظر ہے لیکن نہیں

آج پھر غم کی دیوار میں
یوں لگا در ہے، لیکن ! نہیں

یہ محبت بھری گفتگو !
کوئی منتر ہے لیکن نہیں

دوسروں سے مرا بے وفا
لاکھ بہتر ہے! لیکن نہیں

کج ادائی پہ مائل کوئی
میرے اندر ہے!! لیکن نہیں

نیند کے آخری موڑ تک
خواب رہبر ہے لیکن نہیں

باب در باب وہ داستاں
لاکھ ازبر ہے!! لیکن نہیں

توڑ دے وہم کی ہر فصیل
وقت پتھر ہے لیکن نہیں

پاؤں پھیلا رہی ہے طلب
تنگ چادر ہے لیکن نہیں

کب گزرتا ہے بچپن مرا
دل معمر ہے لیکن نہیں

غم سے رشتہ نیا جوڑنے کے لیے
ایک چھالہ ہے دل پھوڑنے کے لیے

میں وہی بت ہوں جس کو تراشا گیا!
مدتوں دوستو! توڑنے کے لیے

اور تو اس کہانی میں کچھ بھی نہیں !
اک ورق ہے مگر موڑنے کے لیے

اُس سے پوچھو کہ میں، درمیاں میں کہیں
کوئی رستہ ہوں کیا چھوڑنے کے لیے

حوصلہ دیدنی ہے مرے خواب کا
ایک مٹھی زمیں ...دوڑنے کے لیے

❀

دل سوالی ترا، روح پیاسی تری
میں ہوں تیری ہے میری اداسی تری

آنکھ کھلنے سے پہلے مرے خواب کو
توڑ ڈالے نہ غفلت ذرا سی تری

یہ ادب، یہ محبت، یہ وارفتگی
اور شہزادیوں جیسی داسی تری

✿

ہونٹوں پہ میرے نام ترا آکے رہ گیا
جی فرطِ احتیاط سے گھبرا کے رہ گیا

شرطیں تھیں انجذاب کی اتنی کڑی کہ بس
ہر عکس آئینے سے ہی ٹکرا کے رہ گیا!

صدیاں ہوئیں کہ تیری نہیں اس نے لی خبر
معبد میں دیوتا ترا پتھرا کے رہ گیا

اس یارِ طرح دار کی خاموشیوں میں تھا
ایسا سخن کہ حرف بھی شرما کے رہ گیا

کیسا لگاؤ ! کیسی محبت جہان سے!!
دل یار دوستوں سے بھی کترا کے رہ گیا

بے نیاز ہو بیٹھا دو جہاں سے دل میرا
ہو کے آ گیا یارب یہ کہاں سے دل میرا

یہ محل سرا، گنگا، یہ کنواں یہ باغیچہ
کوئی ربط رکھتا ہے داستاں سے دل میرا

بولتے ہیں ہم دونوں اک زباں اداسی کی
رابطے میں رہتا ہے آسماں سے دل میرا

ساعتیں عبادت کی ختم ہونے والی تھیں
بیٹھ بیٹھ جاتا تھا ہر اذاں سے دل میرا

درمیاں سے محفل کے اُٹھ کے جا نہیں سکتی
اُٹھ گیا مگر صاحب ! درمیاں سے دل میرا

اس پہ مہرباں نے اک ہاتھ رکھ دیا اپنا
اور گزر گیا نینا اپنی جاں سے دل میرا

✿

روشنی واہمہ نہ ہو جائے
گم کہیں ہر دِشا نہ ہو جائے

ہو سِرا کوئی ..تھام کر رکھوں
تیری خوشبو ہوا نہ ہو جائے

ایک کے بعد ایک دستک ہے
مسئلہ ہی کھڑا نہ ہو جائے

میری جانب رواں ہے تنہائی
طے ابھی فاصلہ نہ ہو جائے

ہے مرض کو مگر یہ اندیشہ
زرد رو کو شِفا نہ ہو جائے

آسمانوں کا دل دھڑکتا ہے
کوئی ذرّہ خدا نہ ہو جائے

آگ روشن ہوئی مگر نیناؔ
اچھا کرتے برا نہ ہوجائے

یہ شاعری بڑی سچی اور زندہ شاعری ہے۔ یہ کسی شعوری کاوش یا صناعی کے ذریعے وجود میں نہیں آئی ہے۔ اِس کا ماخذ نینا عادل کی روح کی دبیز اُداسی اور ایماندارانہ افسردگی ہے۔ یہی افسردگی اُن کے ایک ایک شبد کو ایک ایماندار ''ہندسے'' کی طرح شفاف بناتی ہے اور سچا بھی (میں نے اپنے افسانے میں غالباً لکھا تھا کہ لفظ کی انتہا یہ ہے کہ وہ ''ہندسے'' میں بدل جائے)

حالاں کہ مجھے علم ہے کہ ''لفظ'' کی ابہامی کیفیت کو شاعری میں قابلِ قدر نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن میرے خیال میں ''لفظ'' یعنی ''شبد'' کو اتنا ایماندار ضرور ہونا چاہیے کہ وہ اپنے چاروں طرف چھائی ہوئی، ابہام کی دُھند کے باوجود ریاکاری سے بچ سکے تاکہ منافقت، جھوٹ اور نفرت کو ایمانداری، سچائی اور محبت سے بالکل الگ پہچانا جا سکے۔ اس کے بعد ہی میں ابہام، علامت سازی اور استعاراتی نظام جیسے شعری اوصاف یا لوازمات کا خیر مقدم کر سکتا ہوں۔

— خالد جاوید

Shabd (Urdu Poetry)
by Naina Adil

arshia publications
arshiapublicationspvt@gmail.com
+91 9971-77-5969
www.arshiapublications.com
arshiapublicationspvt@gmail.com